مجلس ادارت

۱۔ پروفیسر نذیر احمد، علی گڈھ ۲۔ مولانا سید محمد رابع ندوی، لکھنؤ
۳۔ مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی، کلکتہ ۴۔ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڈھ
۵۔ ضیاء الدین اصلاحی (مرتب)

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۶ ماہ شوال المکرم ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۰۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

ای میل: email: shibli.academy@rediffmail.com

شذرات

ادہر مسلسل قدرتی آفتوں نے مشرق ومغرب دونوں کا نظام زندگی تہہ و بالا کردیا ہے، کہیں سمندروں کے طوفان اور کہیں بادوباراں کی شدت وکثرت نے بستیوں کو ویرانے میں تبدیل کردیا ہے تو کہیں قیامت خیز زلزلوں نے فلک بوس محلوں کو زمیں دوز کردیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح عاد وثمود، قوم لوط، اہل مدین، قارون، فرعون اور ہامان کے ظلم وفسق، فساد واستکبار فی الارض وغیرہ کی بناپر ان کو ہلاک کردیا گیا تھا اور فرمانِ خداوندی کے مطابق وہ " اپنی تمکنت وقوت کے باوجود ہم (اللہ) سے آگے نہیں نکل سکے، سب کو ہم نے ان کے گناہ کی پاداش میں دھرلیا، کسی پر ہم نے ہوا سے پتھراؤ بھیجا، کسی کو چنگھاڑ نے پکڑلیا، کسی کو زمین میں دھنسادیا اور کسی کو ڈبادیا، ان پر ظلم کرنا اللہ کو روا نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کررہے تھے، (عنکبوت ۲۹: ۳۹-۴۰) ۸/اکتوبر کو پاکستان کے شمالی ومغربی علاقوں کا زلزلہ چاہے اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (حج ۲۲: ۱) سے کتنا ہی کم تر اور معمولی رہا ہو لیکن اس سے دوچار لوگوں کی آفتوں اور مصیبتوں کی روداد اور دردوالم سے بھری ہوئی جو خبریں ہم نے پڑھی ہیں وہ کسی قیامت سے کم نہیں، مظفر آباد کے زلزلے نے صوبہ سرحد تک پورے ہمالیائی علاقے کو تہس نہس کرڈالا اور اس کی لپیٹ میں کنٹرول لائن کے اس طرف ہندوستان کے جموں وکشمیر کا سرحدی علاقہ بھی آگیا لیکن زلزلے کی زیادہ تباہیوں سے آزاد کشمیر اور پاکستان دوچار ہے جس کی ہلاکتوں اور تباہیوں کا نہ اندازہ لگا ہے اور نہ لگے گا۔

مادی اور طبیعی پہلو سے غور کرنے والوں کو اسے خالص قدرتی حادثہ ماننے میں تامل ہے، ان کے خیال میں اس میں انسانی عقل وتدبیر اور اس کی شرارت اور بدطینتی کا بھی دخل ہوسکتا ہے، جو انسان پہلے ناگاساکی اور ہیروشیما کو کھلم کھلا نیست ونابود کرچکا ہو وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے کام لے کر پس پردہ رہتے ہوئے بھی اپنے مخالفوں کو سبق سکھا سکتا ہے، اس سے پہلے سنامی کی صورت میں جو قہر نازل ہوا تھا اس کے بارے میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا تھا اور اب آزاد کشمیر کے جنگ جوؤں اور دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لیے یہ حرکت کی گئی ہے، اسی لیے ایٹمی تنصیبات زلزلے کی زد سے محفوظ رہیں، بعض لوگوں کے نزدیک عمارتوں کی تعمیر کے ضابطوں کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی اور آسمان سے چھونے والی کثیر منزلہ عمارتوں کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت

لے جانے کی کوششیں حد درجہ خطرناک اور ارضی آفات کی موجب ہیں، ان امکانات کے باوجود اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کائنات کا مالک وحاکم خدا ہے، اس کی مشیت کے بغیر کوئی حادثہ رونما نہیں ہوتا، آسمان وزمین کا قایم رہنا اس کی نشانی اور قدرت کی دلیل ہے، اگر وہ جنبش میں آجائیں تو اس کے سوا کوئی ان کو روک نہیں سکتا، جب لوگ اس کی مرضی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے شروفساد سے نظام حق وعدل میں خلل ڈالتے ہیں تو بروبحر میں فساد پھیل جاتا ہے تاکہ وہ اپنے کرتوت کا کچھ مزہ چکھ لیں، اس لیے ان واقعات میں ان کی عبرت، تنبہ اور تذکر کا سامان ہوتا ہے اور وہ بگڑی ہوئی قوم کو اصلاح حال کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان میں ہلاک ہونے والوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا تو اسلامی فریضہ ہے۔

اعظم گڈھ سے متصل مئو شہر میں روزے کے مقدس مہینے کے شروع ہی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا اور ہفتوں گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہورہا ہے، دونوں فرقے کے لوگ، ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں لیکن دراصل یہ فساد منصوبہ بند معلوم ہوتا ہے جس کے لیے قصداً بھرت ملاپ کا دن منتخب کیا گیا، پولس اور انتظامیہ کی جانب داری اور چھوٹ سے ہندو یوا باہنی اور بی جے پی کے لیڈروں کو خوب کھل کھیلنے اور اشتعال انگیزی کا موقع ملا اور کرفیو کے درمیان مسلمانوں کے کارخانے اور دکانیں جلائی گئیں، گھروں کو لوٹا گیا اور بلوائیوں کے اشارے پر انہیں گرفتار کیا گیا اور مئو کے باہر کے دیہاتوں میں فساد پھیلا کر وہاں بھی زدوکوب، لوٹ مار اور آتش زنی کی گئی، بلوائیوں کے جتھوں نے دوسرے قصبوں کے مسلمانوں کو بھی اپنے تیغ ستم کا نشانہ بنایا، ٹرینوں اور بسوں میں کھوج کھوج کر مسلم مسافروں کو مارا پیٹا اور لوٹا، بلوائیوں کے گروہ نے مسلم مسافروں اور راہ گیروں کو بھی نہیں بخشا، غرض فساد میں سارا نقصان مسلمانوں کا ہوا اور بلوائیوں کی نشان دہی پر ان ہی کو زیادہ تر گرفتار کیا گیا، مئو کے بنکروں کا کاروبار سوت کی مہنگائی اور بجلی کے بحران سے پہلے ہی سے دم توڑ رہا تھا اور اب تہواروں کے زمانے کے فساد نے ان کو بالکل مفلوج کردیا ہے، ریاستی حکومت کی غفلت وتساہلی سے ابھی تک فساد نہیں رکا اور جن لوگوں کے کارخانے اور دکانیں جلائی گئیں، حکومت کی طرف سے ان کے معاوضے کا کوئی اعلان نہیں ہوا ہے۔

گزشتہ ماہ مسلم یونی ورسٹی کے متعلق الہ آباد ہائی کورٹ کے جس فیصلے کا ذکر آیا تھا اس سے مسلمانوں کی تشویش اور بے چینی بجا ہے لیکن اس کے بعد ملک کے سنجیدہ اور حقیقت پسند

غیر مسلموں کے جو بیانات آرہے ہیں، انہوں نے اقلیتوں کے افسردہ چمن میں روح پھونک دی ہے، قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ ترلوچن سنگھ نے کہا'' اس تصور کو ختم کرنا مشکل ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ایک مسلم ادارہ نہیں ہے، ۲۵؍فروری کو مرکزی حکومت کے نوٹیفکیشن کے بعد کوٹا کے تحت داخلہ لینے والے طلبہ وطالبات کے مفاد میں مرکزی حکومت کو مداخلت کرنی چاہیے'' ایک اور ماہر قانون کے خیال میں'' جسٹس ٹنڈن کے فیصلے کے تحت دستور کے آرٹیکل ۳۰ (اے) کے ہی کوئی معنی نہیں رہ جاتے، اگر اس کو سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کیا گیا تو ملک میں مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کے جتنے بھی ادارے ہیں اور جنہیں آرٹیکل ۳۰ کے تحت تحفظ حاصل ہے، ان کا اقلیتی کردار خود بہ خود ختم ہوجائے گا'' سابق وزیر اعظم وی-پی سنگھ نے علی گڑھ میں یوم سرسید کی تقریبات کے موقع پر فرمایا'' حکومت نیا قانون بنا کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرسکتی ہے کیونکہ یہ کروڑوں لوگوں کے ساتھ انصاف کا سوال اور ایک قومی مسئلہ ہے اور اقلیتوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنا قومی مفاد میں ہے، اقلیتی کردار کو کالعدم قرار دینا ایک غلطی ہے جو آئین کی دفعہ ۳۰ کا دائرہ محدود کرنے کے مترادف ہے، مالی امداد کے نام پر حکومت کسی اقلیتی ادارہ کو اس کے اقلیتی حق سے محروم نہیں کرسکتی، ہندوستان کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اقلیتی اداروں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور کسی مرکزی یونی ورسٹی کے اقلیتی ادارہ ہونے پر پابندی عاید نہیں کی جاسکتی، مسلم یونی ورسٹی سیکولر اقدار کو فروغ دینے والی تجربہ گاہ ہے جس کی حفاظت کرنا وقت کی ضرورت ہے''۔

یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ فروغ انسانی وسائل کی وزارت ہائی کورٹ کے فیصلے کو چیلنج کرنے والی ہے، وزارت کے ماہرین قانون اس کا جائزہ لے رہے ہیں اور اس کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ کی ڈویژنل بنچ یا سپریم کورٹ میں اپیل کرے گی، نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی فار مائنارٹیز ایجوکیشنل کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین جناب ظفر علی نقوی نے اپیل کو ضروری بتاتے ہوئے اس پر خوشی ظاہر کی ہے کہ حکومت ہند نے اس معاملے میں قانونی کارروائی کا منشا ظاہر کیا ہے، وائس چانسلر مسٹر نسیم احمد نے کہا کہ'' الہ آباد ہائی کورٹ نے داخلہ پالیسی پر جو فیصلہ کیا ہے، اس سے علی گڑھ برادری اور اقلیتوں سمیت جمہوری اقدار کو فروغ دینے والوں کو تکلیف پہنچی ہے، اس سلسلے میں جو شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اسے ناکام کرنے کی ضرورت ہے، ہم اپنے اقلیتی کردار کو باقی رکھنے اور مسلمانوں کے رزرویشن سے متعلق داخلہ پالیسی پر ہر جگہ اپنا موقف پیش کریں گے''۔

مقالات

موجودہ دور میں علامہ شبلیؒ کے اثرات اور معنویت

از:- پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی☆

علامہ شبلیؒ اپنے دور کی عظیم ترین اور اہم ترین شخصیت تھے، انہوں نے اسلوب اور معنویت دونوں اعتبار سے اس قدر متنوع اور گوناگوں خدمات انجام دی ہیں کہ اپنے دور سے آج تک کوئی دوسرا ان کا ہم قدم اور ہم سفر نظر نہیں آتا، بیسویں صدی میں جتنی تحریکیں معرض وجود میں آئیں وہ کسی نہ کسی طرح شبلیؒ کی رہین منت ضرور ہیں۔

علامہ شبلیؒ کے مطالعہ کے دو طریقے ہوسکتے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ ان کے کن ذہنی عوامل نے ان کو اس قدر اہم بنایا، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے دور کا سماجی اور سیاسی انتشار بڑی حد تک علامہ شبلی کے زمانے کے انتشار سے مناسبت رکھتا ہے، اس لیے ہم اپنے زمانے کے انتشار کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ شبلی کا مطالعہ کریں اور اس سے اپنے طور پر مستفید ہوں، جہاں تک شبلی کے ذہنی عوامل کا تعلق ہے ہم کو ان کی تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا ہوگا۔

علامہ شبلی حقیقی معنوں میں ایک عبقری تھے، ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ بے دار مغز، روشن خیال اور دور بین انسان تھے، یوں تو ان کی ساری زندگی شعار اسلامی کا نمونہ تھی لیکن انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں کو جلا بخشی، اپنے شان دار ماضی کا احساس پیدا کیا، اپنی وراثت کی قدر کرنی سکھائی، ان کے ذہن وفکر کے دھاروں کو نئی

☆اے خالق فلیٹ، ۱۸۰-اے، پائپ روڈ، کرلا، ویسٹ ممبئی۔

جہت دی، ایک طرف انہوں نے اپنے تحریر کے تازیانوں سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بے دار کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ادب و انشا، تاریخ و سوانح نگاری، الکلام اور علم الکلام، تنقید و تبصرہ، مکاتیب و خطبات و تراجم کی شکل میں اپنے لافانی نقوش چھوڑے جن کی شاہد ان کی گراں بہا تصانیف ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے علامہ شبلیؒ کے سانحہ ارتحال پر ایک مضمون میں ہندوستان کے دور اصلاح میں دو گروہوں کا ذکر کیا ہے، اول الذکر مصلحین اور مجددین میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم کا نام لیا ہے، جنہوں نے زمانہ کی ضرورتوں سے قطعاً چشم پوشی کرلی تھی اور صرف قدیم ہی کی حفاظت کو ملت کے لیے ذریعۂ نجات سمجھا اور مسلمانوں کے دلوں کو اپنے فیض سے روشن کیا، دوسرا گروہ تھا جس نے قدیم کو چھوڑ کر صرف جدید کے حصول پر اپنا سارا زور صرف کیا، اس گروہ کے سرخیل تو سرسیدؒ تھے اور ان کے علاوہ محسن الملک، مولوی سید کرامت علی، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی اور مولانا شبلی تھے، سید صاحب علامہ شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم اس بزم میں سب سے پیچھے آئے لیکن سب سے پیچھے نہیں بیٹھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان دو گروہوں کے مجمع البحرین تھے یعنی قدیم علوم سے بہرہ مند تھے اور جدید سے اپنے ہم عصروں کی طرح آشنا، پھر قدیم علوم میں بھی اللہ تعالیٰ نے گوناگونی کے ساتھ مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں ان کی ذات میں ودیعت کی تھیں، اس لیے تماشاگاہ عالم میں کمال کا جوہر انہوں نے دکھایا، یقین ہے کہ دنیا زمانہ تک ان کی مثال پیش نہ کرسکے گی ع

شبلی زخیل زمزمہ سنجاں حشم گرفت ‏ ‏ بااین کہ ہیچ گونہ زخیل و حشم نداشت

مولانا کے حریف تلوار کا صرف ایک ہی وار جانتے تھے، یا فقیہ و محدث یا متکلم و فلسفی یا فقط انشاپرداز یا زباں داں خطیب، سخن فہم و سخن سنج لیکن یہ یگانہ روزگار مجموعہ علم و فن تھا، جس رستہ پر قدم رکھا، میدان میں سب سے آگے نظر آیا، علوم دینی و شرقی میں جو تبحر ان کو نصیب ہوا اس سے یہ جدید ارکان یکسر خالی تھے اور قدیم علما جدید مسائل سے بے خبر تھے، تاریخ کا وہ اس کارزار میں

تنہا جوہری تھا، فلسفہ و کلام کا وہ امام تھا، شاعری کا وہ کہنہ مشق استاد تھا، انشاپردازی کے پامال کوچہ میں اس کی راہ الگ تھی، سخن سنجی اس کے ظاہرانہ کمال کے شہپر تھے۔

اس کی دوسری جامعیت یہ تھی کہ وہ صرف دماغ ہی نہ تھا، اس کا دماغ جس دینی و ملی کارناموں کا تماشا دیکھتا تھا اور دکھاتا تھا بہت سی آنکھیں اسے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، قومی تحریکوں کے عواقب میں جہاں اس کی نظر پہنچی حریف اس کے دیکھنے سے قاصر تھے، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سائنسی، ادبی، مذہبی غرض عملاً کوئی گوشہ نہ تھا جس کی طرف اس کا ہاتھ نہ بڑھا ہو، بااین ہمہ اس کا مخصوص فن صرف تاریخ اور کلام رہا''۔(۱)

مولانا شبلی کے سوانح نگار اور حیات شبلی کے مصنف سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی نعمانی کو ''عہد جدید کا معلم اول'' قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم تھے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے اور اسی لیے ان کی زندگی کے کارنامے گزشتہ علمائے دین کے کارناموں سے نسبتاً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا و خیالات سے واقفیت رکھتے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے اور نئے زمانے کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گوناگوں رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں''۔(۲)

سرسید اور شبلی

سرسید کے تمام رفقا بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ہر فرد ایک ادبی ریاست کا قلم رو تھا لیکن علامہ شبلی خصوصاً بڑے فعال اور متحرک تھے، وہ ہر معاملہ میں اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے اور دوسروں کی رائے سے مرعوب نہ ہوتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ سرسید کا ساتھ بہت دنوں تک نہ دے سکے، سرسید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے بڑے ہمدرد تھے لیکن نصب العین تک پہنچنے کے لیے دونوں کے نقطہ نظر میں بہت بعد تھا، سرسید کو حال و مستقبل سے دل چسپی تھی، مولانا شبلی کو حال و مستقبل کے ساتھ ماضی سے بھی لگاؤ تھا، رجحان کے اس اختلاف نے مولانا شبلی کو سرسید سے الگ ہونے پر مجبور کیا اور یہی وجوہ تھے جو بعد میں ندوہ اور دارالمصنفین کے قیام کی شکل میں نمودار ہوئے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس معاملہ میں صائب رائے ملاحظہ ہو:

''پچھلی صدی کی فکری تاریخ میں ہمیں صرف دو ایسے بزرگ نظر آتے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے زمانے کے منفرد سربرآوردہ اور یکتا تھے، اول سرسید احمد خاں اور دوم شبلی، دونوں مقاصد میں ہم آہنگ تھے، اگرچہ زاویہ نظر میں دونوں کا اختلاف تھا، سرسید اپنے زمانہ کے حالات، اپنے زمانے کی تہذیب اور اپنے زمانہ کے علوم سے مفاہمت کے قایل تھے اور شبلی مفاہمت کے بجائے مقابلہ کو ضروری خیال کرتے تھے''۔ (۳)

علامہ شبلی محض مفاہمت کے بجائے ترقی کے بھی خواہاں تھے، وہ اسلام کی پرانی دعوت کو آگے بڑھانا چاہتے تھے اور وہ اسی اصول پر کاربند رہے، ڈاکٹر عبداللہ مزید لکھتے ہیں:

''شبلی کے نزدیک روایت اور روایات ملی تاریخ سے بہ طور ورثہ منتقل ہوتی ہیں ان کا یہ خیال تھا کہ ترقی کا ہر قدم ماضی کی اساس پر ہونا چاہیے، انہوں نے فرمایا ''لوگ کہتے ہیں کہ آگے دیکھو، میں کہتا ہوں، پیچھے ہٹو اور اتنا ہٹتے جاؤ، اتنا ہٹتے جاؤ کہ صحابہؓ کے زمانہ میں پہنچ جاؤ اور اس سے بھی پیچھے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پہنچ جاؤ''۔ (۴)

علامہ شبلی حریت فکر اور سیاسی آزادی کے علم بردار تھے، وہ سرسید کی طرح جدیدیت کے حامی تو تھے مگر اس سے مرعوب بالکل نہ تھے، مندرجہ ذیل دو مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

فوٹو اور تصویر کا مسئلہ اس زمانہ میں بڑا اہم تھا، اس مسئلہ پر مسلمانوں میں شدید اختلاف تھا کہ تصویر کھنچوائی جائے یا نہ کھنچوائی جائے، شبلی نے اپنی تصویر کھنچوانے کی بات کو برا نہ سمجھا اور خود اپنی تصویر کھنچوا کر اپنے دوستوں کو بھیجی، دوسرا مسئلہ مسلمان خواتین کے پردے کا تھا، مولانا شبلی نے پردہ کی مخالفت نہیں کی لیکن جہاں کہیں ان کا سابقہ مسلمان خواتین سے پڑا اور ان خواتین نے پردہ سے باہر آ کر گفتگو کرنے یا تقریر کرنے یا قومی مسایل میں دل چسپی لینے کا اظہار کیا، مولانا شبلی اس دور میں غالباً پہلے بزرگ تھے جنہوں نے نہ صرف اس کی تائید بلکہ ساتھ ساتھ تعاون بھی کیا، قدامت پرستی کے اس دور میں ان دونوں مسئلوں پر مولانا کے موقف کی علمائے دین نے شدید مخالفت کی مگر وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔

اس تمہید کے بعد اپنے اصل موضوع کی طرف مراجعت کرتا ہوں کہ موجودہ دور میں

ہماری ملی و قومی زندگی پر علامہ شبلی کے اثرات کیا ہیں اور ان کی معنویت کس قدر ہے۔

ہماری زندگی پر علامہ شبلی کا پہلا اور اہم اثر تاریخ کا شعور پیدا کرنا ہے یعنی اسلام کے شان دار ماضی کے شان دار پہلوؤں کو قوم کے سامنے اس طرح لانا کہ قوم کی ذہنی مرعوبیت ختم ہو جائے، مولانا شبلی نے اس سلسلہ میں ترقی کے نظریہ کے خلاف تاریخ کے نظریہ کو اپنایا، تاریخی شعور کا مقصد احیائے دینی، نشاۃ ثانیہ اور نئی زندگی کا شعور پیدا کرنا تھا، مولانا شبلی نے اسلام اور اسلامی تہذیب کی مدافعت کی، مستشرقین اسلام اور آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی پر جو قابل نفریں حملے کر رہے تھے خود سر ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ پر بڑے رکیک حملے کیے، بدقسمتی سے جدید تعلیم یافتہ حضرات یہی کتابیں پڑھتے تھے اور ان سے متاثر ہوتے تھے، مولانا شبلی کی نظر اس پر رہی کہ جو الزامات مستشرقین یورپ کی طرف سے عاید کیے جائیں، ان کے جواب علمی انداز میں دیے جائیں۔

مولانا شبلی نے اس مدافعت میں کبھی معذرت کا پہلو اختیار نہیں کیا بلکہ مثبت انداز میں اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی کی، ان کا یہ انداز جرأت مندانہ بھی تھا اور فلسفیانہ بھی، شبلی نے دو درجن کتابیں اور بے شمار مضامین ہمارے روشن ماضی سے متعلق لکھے، انہوں نے الفاروق، المامون اور مولانا روم کی سوانح حیات لکھ کر ہماری توجہ ہمارے شان دار ماضی کی طرف مبذول کرائی، علامہ شبلی کی اس تحریک کے دو فایدے ہوئے، ایک تو یہ کہ انہوں نے نئی نسل کو نفسیاتی طور پر حیات تازہ بخشی، اکھڑے ہوئے قدموں کو ماضی سے ایک زبردست سہارا مل گیا۔

دوسرا بڑا فایدہ یہ ہوا کہ تاریخ کو باقاعدہ طور پر مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، ہندوؤں کی جانب سے بھی اور انگریزوں کی جانب سے بھی، ایسے موقع پر علامہ شبلی نے اپنی تاریخ سے محبت کرنے کا سبق دیا اور یہ سبق آج تک ہماری قومی زندگی میں شامل ہے۔

اگر ہماری قومی زندگی میں صرف سرسید کی تحریک رہتی اور اس کے ساتھ ساتھ شبلی کی تاریخ نویسی کا دھارا شامل نہ ہوتا جس سے دارالمصنفین اور ندوۃ العلما کے دو چشمے پھوٹے تو غالباً ہم میں سے اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی وہ صلاحیت نہ ہوتی جو اس وقت موجود ہے۔

علامہ شبلی کے بعد ان کے لایق و فایق شاگردوں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام

ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور دیگر رفقائے دارالمصنفین نے اس اہم کام کو اپنی زندگی کا مقدس مشن بنالیا، دارالمصنفین کی موجودہ دور سے متعلق تاریخ کی کتابیں اس پایہ کی ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے کچھ تنگ نظر اور فرقہ پرست مورخین نے اسلام اور مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کو جس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا سد باب ہونا چاہیے۔

تاریخ سے متعلق مولانا شبلی کی ان کاوشوں کی معنویت تو ہر دور میں رہے گی لیکن قابل افسوس یہ بات ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل میں اس کے اثرات نہیں کے برابر ہیں، کیوں کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ سے بالکل نابلد ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ نسل کے لوگوں میں تاریخ کی واقفیت ازسرنو عام کی جائے اور مسلمان مورخین اور غیر جانب دار ہندو و انگریز مورخین ایسی کتابیں اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں شایع کریں، مسلمانوں کا دانشور اور صاحب استطاعت طبقہ ان کو چھپوائے اور اس تاریخ کو نئی نسل کے مسلمانوں میں عام کیا جائے، ڈاکٹر سید عبداللہ علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ سے متعلق رقم طراز ہیں:

"تاریخ میں شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ انسانی (خصوصاً تاریخ اسلامی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے) وہ صرف مورخ ہی نہیں تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع اور نقاد بھی تھے، انہوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمایہ پر جو تنقید کی ہے وہ بلا مبالغہ اصول تاریخ کے لیے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے"۔ (۵)

ہماری قومی زندگی پر علامہ شبلی کا دوسرا گہرا اثر اسلام کی مدافعت اور اسلامی اصولوں کی حفاظت کا ہے، جس زمانہ کا ذکر کیا جارہا ہے، اس زمانہ میں نہ صرف ہماری تاریخ کو مسخ کیا جارہا تھا بلکہ اسلام کے عقاید اور اصولوں پر بے دریغ حملے بھی کیے جارہے تھے، کچھ تو انگریزوں کی شہ پر اور کچھ ہندو تنظیموں کی منظم سازش کے نتیجہ میں، عملاً مسلمانوں کو ہندو بنایا جارہا تھا، علامہ شبلی کی عربی علوم کی وابستگی نے اس فرض کی ادائیگی کا ان کو اور زیادہ اہل بنادیا کہ اسلام پر جو حملے ہورہے ہیں ان کا مدلل جواب دیا جائے، مولانا نے مقابلے کے لیے افراد جمع کیے، مناظرے منعقد کرائے، تبلیغ دین پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین کی، اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے اور لوگوں

میں ایک خاص شعور پیدا کیا اور اسلامی تعلیمات پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین کی، اس کوشش کے اثرات آج تک دیکھنے میں نظر آتے ہیں، جناب سید حامد مولانا شبلی کے اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"شبلی کا اس دور میں یہ عالم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں اور عالم اسلام جب جب اور جن جن واقعات وحادثات سے دوچار ہوتے تھے، ان کی بازگشت شبلی کے مضمونوں، تقریروں اور نظموں میں برجستہ سنائی دیتی تھی، دراصل یہ شخص ایسا تھا جو مسلمانوں کے ردعمل اور ان کے مزاج کا آئینہ دار تھا، ساتھ ہی ان کے جذبات کی ترجمانی اور مداوا کی تدبیر بھی کرتا تھا"۔ (۶)

موجودہ دور کی متعصب اور تنگ نظر سیاست نے ملک کی فضا کو جس طرح مسموم کر رکھا ہے اور اسلام کے خلاف جس طرح زہر افشانی کی جارہی ہے، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تبلیغ اسلام کے اس پہلو کی پرزور تائید کی جائے، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور دوسری اہم مسلم جماعتیں اس ضمن میں کام کررہی ہیں، مگر بعض اوقات خود مسلمان مسلکی اختلافات کے سبب باہم دست وگریبان ہونے لگتے ہیں، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سرجوڑ کر اس کام میں لگ جائیں اور اس مشن کو تیز تر اور باعمل بنائیں۔

علامہ شبلی کی تیسری منفرد خصوصیت ان کی یہ آرزو تھی کہ مسلمانوں کی قیادت علما کے ہاتھ میں ہو اور ایسے علما پیدا کیے جائیں جو حالات حاضرہ سے باخبر ہوں اور اپنی قوم کے اندر اسلام کا شعور اور اسلام کی محبت بر بنائے بصیرت پیدا کرسکیں، مگر وہ اپنے زمانے کے بیشتر علما سے مایوس تھے، بہت کم ایسے تھے جو اپنی عبادت گزاری، طہارت و پاکیزگی اور اسلام دوستی کے باوجود مولانا شبلی کے ساتھ نہ چل سکے تھے، مدرسوں میں جس قسم کی عربی پڑھائی جاتی تھی اس سے صرف حفاظ، قاری، امام و موذن تو پیدا ہورہے تھے مگر عالم باعمل مفقود تھے، وہ عربی زبان بولنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے تھے۔

مولانا شبلی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ نئی نسل کے تعلیم یافتہ لوگوں کی نسبت کہیں بہتر ہو کہ مسلمانوں کی قیادت وہ علما کریں جن میں حدیث وقرآن سے عملی دل چسپی ہو اور اس سے زیادہ لسانی وابستگی پائی جاتی ہو، مولانا اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ

زیادہ خلوص کے ساتھ علما کو سمجھنے کی کوشش کرے اور علمائے کرام میں زیادہ ہمدردی بلکہ کسی حد تک فراخ دلی کے ساتھ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔

مگر علامہ شبلی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، علما جدید نسل کے مسایل کو سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے انہوں نے مولانا شبلی کی سر جوڑ کر بڑی شد و مد سے مخالفت کی اور ان کے تعمیری کاموں میں رکاوٹیں پیدا کیں، اس سے مولانا شبلی کو تو نقصان کم پہنچا لیکن علما کو زیادہ، آل احمد سرور اس کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

"علما میں شبلی جیسے روشن خیال اور دور بیں اشخاص بہت کم ہوئے ہیں، اس سے علما کو بھی نقصان پہنچا ہے اور ہندوستان کو بھی اور اب شاید ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی ذہنی قیادت ان سے چھن گئی ہے"۔(۷)

علامہ شبلی کا اپنا ایک مخصوص تعلیمی نظریہ تھا، وہ قدیم و جدید میں ایک سنگم کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا نظریہ تعلیم امتزاجی تھا، شبلی قدیم تعلیم کے ناقد تھے اور جدید تعلیم کے بھی، جدید تعلیم کے اچھے عناصر کو وہ چاہتے تھے مگر قدامت کے بہتر عنصر کو فراموش بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

علامہ شبلی کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہمارے دینی مدارس نے ایک عرصہ سے نئے علوم کو نصاب میں جگہ دینے سے انکار کیا ہے، نہ نصاب میں کوئی تبدیلی کی ہے نہ طرز تدریس کو زمانہ کے تقاضوں اور تجربوں کی روشنی میں ڈھالا ہے، وہ نصاب تعلیم میں عصری علوم کی شمولیت ضروری سمجھتے تھے، انہوں نے ندوۃ العلما کو اوایل ایام میں اسی نہج پر ڈھالنے کی کوشش کی، ان کا اصرار تھا کہ ندوہ میں انگریزی پڑھائی جائے، مقصد یہ تھا کہ ہمارے عالم ایسے ہوں جو اسلام کے تعلق سے پھیلائے گئے نئے مشبہات کا ازالہ کرسکیں جو جدید دنیا بالخصوص مغربی دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح شبیہ پیش کرسکیں اور انہیں قایل کرسکیں کہ ابتدا زمانہ سے اسلام کی عملی اہمیت اور مقبولیت کسی عنوان کم نہیں ہوئی ہے مگر افسوس کہ علامہ شبلی کی یہ سعی مشکور اپنی زندگی میں پوری نہ ہوسکی۔

موجودہ دور میں جب کہ تعصب اور تنگ نظری کے سبب اردو زبان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کا برا حال ہے، مکاتب و مدارس سے بھی اسلامی تعلیم اور اردو کا فروغ وابستہ ہوکر رہ گیا ہے، مسلمانوں کو اس جانب توجہ کرنا

چاہیے اور اس کا معقول حل نکالنا چاہیے، کوشش اس بات کی ہو کہ مدرسوں کو حکومت وقت کی قید و بند سے آزاد بنایا جائے، انہیں عصری علوم من جملہ انٹرنیٹ و کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹکنالوجی سے لیس کیا جائے اور خود کفیل بھی، شبلی کی زندگی کا آخری مشن دارالمصنفین کا قیام تھا جس کا خاکہ انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کرلیا تھا مگر افسوس کہ ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی۔

شبلی مصنفین کا ایک ایسا حلقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو ذہنی یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ دنیاوی خرخشوں سے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر علمی و تحقیقی کام کرسکیں، نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نئے لکھنے والوں کی تربیت کا بھی اہتمام کیا جائے، مولانا کے رفقا مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ نے اس خواب کی حسین تعبیر دارالمصنفین کی شکل میں پوری کردی، جہاں بڑے جید علما اور مصنفین انتہائی معمولی مشاہرہ پر شب و روز اپنے کاموں میں منہمک رہے، یہی وہ بوریہ نشین شہنشاہان ادب ہیں جنھوں نے تقریباً نوے سال کے عرصے میں دو سو عظیم کتابیں علوم و فنون سے متعلق اہل اسلام اور اردو دنیا کو دیں، جن پر عالم اسلام ابدالآباد تک فخر کرسکتا ہے، اس ادارہ نے "معارف" جیسا وقیع رسالہ نکالا جس کی علمی و ادبی فصاحت اظہر من الشمس ہیں، جس نکتہ کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہیے تھا لیکن بعد میں کیا جارہا ہے، وہ یہ کہ اردو میں شبلی کی اہمیت اس کے اکابر اہل قلم اور اس کی نثر کے عناصر خمسہ میں شامل ہونے تک محدود نہیں رہی، انہوں نے اردو زبان کی ترویج و تحفظ کی تدابیر بیسویں صدی کے اوایل یعنی پہلی دہائی میں کیں، وہ موجودہ انجمن ترقی ہند کے بنیاد گزاروں میں ہیں، وہ اس انجمن کے ۱۹۰۳ء میں پہلے سکریٹری تھے، آج انجمن ترقی ہند، اردو کا ایک وقیع ادارہ ہے اور علامہ شبلی کے خوابوں کی حسین تعبیر بھی، اردو کی ترویج و اشاعت و تحفظ و بقا کے لیے اس کا کام قابل ستایش ہے۔

مولانا شبلی سے متعلق "یک سر و ہزار سودا" کا مقولہ یاد آتا ہے، وہ کون سی تحریک ہے جس میں وہ موجود نہیں، وہ کون سی مجلس ہے جس کے وہ صدر نشین نہیں ہیں، ان کی جامعیت سے متعلق ابتدائی مضمون میں علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے دی جاچکی ہے، اب ذرا جستہ جستہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ رائیں بھی ملاحظہ ہوں:

"قلم سے انگلی پکڑ کر جب چلنا بلکہ چلنا کیوں کہیے گھسٹنا سیکھا اور زبان کو کچھ شد بد آگئی تو سب سے پہلا استاد کامل جو نصیب ہوا وہ مولانا شبلی تھے"۔ (معاصرین، ص ۶۶)

"یوں بھی قوم کی فلاح و رفاہ کی تحریک میں پیش پیش رہتے تھے"۔ (ص ۷۰)

"الکلام، سیرۃ النبی، الفاروق، الغزالی کتنی کتابوں میں اور کن کن مقالوں اور مضمونوں میں یہاں تک کہ خالص ادبی کتابوں میں دین کی نصرت و دفاع کے کیا کیا پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور ان کے لیے کن کن کلامی پہلوؤں کی رعایت رکھی ہے"۔ (ص ۷۱) (۸)

مولانا شبلی سرسید کے بعد غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور سرسید کے بعد ان کی تحریروں اور عملی زندگی میں آزادی رائے اور فکری گہرائی کا وافر عنصر پاتے ہیں، سرسید کی نظر دور جدید پر مرکوز تھی، مولانا شبلی کی نگاہ قدیم اصولوں پر تھی، مولانا شبلی نے سرسید کے خیالات سے اختلاف کر کے ایک جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی، یہاں علم الکلام پر تفصیل سے گفتگو کی گنجایش نہیں مگر مولانا شبلی کی تعقل پسندی اس معاملے میں عموماً پسند کی گئی، ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ متوازن رائے ملاحظہ ہو:

"یہ بات بالیقین کہی جاسکتی ہے کہ اس صدی میں شبلی کی تصنیفات مذہبی نے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو بے حد متاثر کیا، سرسید کا اثر یقیناً گہرا، دوررس اور ہمہ گیر تھا مگر ان کے نام سے بعض ایسے سیاسی اور دینی عقاید منسوب ہوگئے تھے جو عام تو کیا خواص کی نظر میں بھی پسندیدہ نہ سمجھے جاتے تھے، شبلی نے ان الجھنوں سے بچنے کی کوشش کی ہے"۔ (۹)

مولانا شبلی اپنے ایک خط میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

مجھ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا کرنے میں میرا حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کو برانگیختہ کہنا میری قسمت میں بھی تھا"۔ (۱۰)

مولانا شبلی اپنے رفقا سے عمر میں سب سے چھوٹے تھے، نوجوانوں پر نئی چیز کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر شبلی خود قوت فیصلہ نہ رکھتے تو وہ بھی حالی، محسن الملک اور وقار الملک کی طرح سرسید کی شخصیت میں ضم ہو جاتے، اس احترام کے باوجود جو ان کو سرسید سے تھا اور جو ان کی تحریروں یا تقریروں سے ظاہر ہے وہ سرسید کے اندھے مقلد نہ تھے، سرسید کی جس رائے کو غلط سمجھتے تھے اس

سے برملا اختلاف ظاہر کرتے تھے، پروفیسر آل احمد سرور کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

"شبلی نے علی گڑھ پہنچ کر بہت ترقی کی تھی، وہ سرسید سے بھی آگے دیکھ رہے تھے"۔ (۱۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اکرام نے موج کوثر میں شبلی کو سرسید کا مقابل ٹھہرایا ہے، یہ بات صحیح نہیں، شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں، اس کی اصلاح کرنا تھا، اگر حیات شبلی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی"۔ (۱۲)

"شبلی ایک دبستان" کے مصنف ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے اپنے مضمون "شبلی اور سرسید" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"سرسید کا کام ایک طور پر ان کے بعد ختم ہوگیا اور گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں کوئی دوسرا سرسید پیدا نہیں ہوا علی گڑھ میں، جن نظریوں کو انہوں نے جس جگہ چھوڑا تھا وہ اب تک وہیں ہیں، ان میں اب تک کسی کو ترمیم و اضافہ کا احساس پیدا نہیں ہوا، بااین ہمہ سرسید کا تعلیمی فیض اب تک جاری ہے، محسن الملک اور وقار الملک آئے اور خدمت کر کے چلے گئے، حالی کے جانشین عبدالحق کہے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو صرف زبان کے لیے مخصوص کر لیا، مذہب و سیاست سے وہ پرہیز کرتے ہیں پھر یہ کہ عبدالحق کی تحریکیں حالی کی نہیں ان کی اپنی ہیں، اس لیے صرف شبلی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن کے کارنامے اگر سرسید کے کارناموں کو بے رنگ نہیں کر دیتے تو خود بھی بے نور نہیں ہو جاتے، ان کے نظریوں کی تبلیغ و اشاعت ان کے جانشین کر رہے ہیں اور جو کام وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے اسے انہوں نے مکمل کیا ہے، جو باقی رہ گیا ہے اس کی تکمیل ہوتی رہے گی اور جس عزم و استقلال اور خلوص و دیانت داری سے کام جاری ہے وہ تکمیل کی ضمانت کے لیے کافی ہے"۔ (۱۳)

مولانا شبلی کے ان زریں اصولوں، عملی کاموں، عالمانہ و محققانہ تصانیف نے جہاں ان کو حیات جاوید بخشی وہیں بعض علمی حلیفوں، معاندین اور نقادوں نے ان کے خلاف بے جا تنقیدیں اور گمراہ کن تصانیف بھی شایع کیں اور سب سے زیادہ مذموم کوشش ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی گئی مگر اس سے شبلی کا قد تو اور بلند ہوا مگر ان لوگوں کی قسمت میں رسوائی و بدنامی

ہی رہی، سید صباح الدین عبدالرحمن اپنی تصنیف ''مولانا شبلی ایک نظر میں'' بالکل صحیح لکھتے ہیں:

''ان میں غیر معمولی قوت عاطفہ تھی، ان کی حرکی طاقت ان کو بے چین اور مضطرب رکھتی تھی، ان کو اپنی عظمت کا بھی احساس تھا جس کو بہتر طور پر بروئے کار لانا چاہتے تھے، وہ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کے قدرداں رہے، اسی لیے انہوں نے مسلمانوں کو یہ زاویہ نگاہ عطا کیا جس سے وہ اپنے ماضی کی عظمت و جلالت کا احساس کرکے اپنے حال و مستقبل کو سنوار سکتے ہیں لیکن عصر جدید کی ساری تبدیلیوں اور نیرنگیوں کو ان کی چشم بینا نظرانداز بھی نہیں کرسکتی تھی، قدیم طرز کی تعلیم پانے کے باوجود جدید دھارے ان کے قدموں سے آلگے، اس طرح وہ قدیم و جدید خیالات کی ایک انجمن بن گئے، روشن ضمیری اور روشن خیالی کے ایک مرصع تخت پر بیٹھے، مذہب کا تاج اپنے سر پر رکھا مگر دونوں ہاتھوں میں رواداری، فراخ دلی، سیر چشمی اور بے تعصبی کا عصا مضبوطی سے پکڑے رکھا اور پھر اپنی پوری زندگی کو یہ پیام بتا گئے کہ روادار اور فراخ دل بن کر کیسے کوئی ایک ساتھ ادیب، شاعر، نقاد، مورخ محقق، متکلم، مفکر، مصلح، ماہر تعلیم اور ضرورت کے وقت انقلابی ہوسکتا ہے اور قوم کی شاہراہ کی صحیح منزل متعین کرسکتا ہے، ان کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ہوئی وہ ان کے خاص طرز تحریر کی مثالی مہارت تھی، سرسید نے ایک کان سے اردو نثر نگاری کا ایک ہیرا ضرور نکالا، اس میں بلاشبہ حالی نے جلا پیدا کی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد نے اس میں چمک دمک پیدا کی مگر اس ہیرے کو جس نے کوہ نور بنایا وہ مولانا شبلیؒ ہیں، بلاغت، فصاحت، دل نشینی، روانی، برجستگی وغیرہ کی جو بھی تعریف ہو، مولانا کی تحریریں اس کے پورے معیار پر اتریں گی، موضوع جو کچھ بھی ہو اس کے ادائے مطلب میں انہوں نے بڑی رنگارنگی دکھائی، تفسیر کی وقت آفرینی ہو، فقہ کی ذہن رسی ہو، علم کلام کی نکتہ پروری ہو، تاریخ کی بالغ نظری ہو، ادب کی چاشنی ہو، انشا کی گل پاری ہو، تعلیمی مشوروں کی دل سوزی ہو، فلسفہ کی خشکی ہو، رزم کی معرکہ آرائی ہو، بزم کی نشاط انگیزی ہو، سب میں ان کے قلم کی دل پذیری، دل نشینی اور بوقلمونی دکھائی دیتی ہے، اس وصف کے سہارے طرز استدلال میں ان کی رائے کی خوداعتمادی اور شیوہ بیانی کا جلوہ صدرنگ اس طرح نظر آتا ہے کہ کبھی کبھی اس میں للکار ہے، کبھی پکار ہے، کبھی حدی خوانی ہے، کبھی رجز خوانی ہے، کبھی مدرسانہ انداز کی ڈانٹ پھٹکار بھی ہے، کبھی بگڑے ہوئے ذہن پر

بجلی کی سرعت کے ساتھ ہلہ بھی ہے، کبھی روٹھے ہوئے کو مناتے بھی نظر آتے ہیں، کبھی ذہنی فضا کو اپنے آداب مطلب کے گلاب کی پنکھڑیوں سے معطر کردیتے ہیں، کبھی مایوسی کو تاریکیوں کو امیدوں کی کرنوں سے روشن کردیتے ہیں، کبھی جذبات میں ہلچل پیدا کرکے جو چیز تسلیم کرانا چاہتے ہیں تسلیم کرالیتے ہیں، ان کے اسلوب کی رنگارنگی میں ان کا کوئی حریف نہیں ع

پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی (۱۴)

علما کی تنگ دلی اور تنگ خیالی سے عاجز آکر مولانا شبلی نے ندوہ سے رخت سفر باندھا اور وہ قیادت جو کہ وہ علما کے ہاتھ میں دینا چاہتے تھے وہ بھی پوری نہ ہوئی، ندوہ چھوڑ کر انہوں نے اعظم گڈھ میں اپنی دنیا بسائی اور اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی، علما کی قیادت کے سوال اور نئی نسل پر مولانا شبلی کے اثر کی نشان دہی پروفیسر آل احمد سرور اس طرح کرتے ہیں:

''نئی نسل پر شبلی کا اثر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ہوا ہے، حالی نے اردو ادب کی دنیا بدل دی مگر شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا، انہیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی، انہیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسایل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا، ان کی حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی، سید سلیمان، ابوالکلام، عبدالسلام ندوی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، اقبال سب پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے، اکرام نے یہ غلط نہیں لکھا کہ نئی نسل سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے، یہ اثر قدرتی تھا، سرسید کے جانشینوں نے سرسید کے انقلابی پیغام کو ایک نیم سرکاری ادارے کی خاکستر میں چھپا دیا تھا، نئے لوگوں نے قدرتی طور پر گرمی ان سے لی، جو اس اثر سے آزاد تھے''۔(۱۵)

سرور صاحب نے ''تنقید کیا ہے'' کے دوسرے اڈیشن کی تحریر میں قدرے تغیر کے ساتھ مولانا شبلی کی جامعیت پر مکمل روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کا اثر حالی کی طرح صرف ادب پر نہیں پڑا پوری ذہنی زندگی پر پڑا ہے، اپنے دور میں وہ سب سے رنگین، جاذب نظر اور جامع شخصیت رکھتے ہیں، وہ اگرچہ ایک لحاظ سے سرسید سے قدیم ہیں لیکن آخر دور کے سرسید کے مقابلے میں زیادہ حریت پسند ہیں، انہوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم میں ادب کی تازگی اور شگفتگی پیدا کی، انہوں نے علما کی نسل کو اپنے

ماضی کا تجزیہ کرنے اور حال سے فیض اٹھانے کے لیے تیار کیا، وہ سرسید اور حالی جیسے سادہ مزاج نہیں تھے، ان کی ایک عالم کی شان تھی، وہ دوسروں کی تعریف بھی کم کرتے تھے مگر وہ بڑے ستھرے اور دل کش مذاق کے مالک تھے، وہ مولویوں کی اصلاح نہ کرسکے مگر نئی نسل کے مذاق پر گہرا اثر چھوڑ گئے، افسوس ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان کی علمیت پر نظر رکھی، ان کے ذہن کی لپک اور شعریت پر توجہ نہ کی مگر نئی نسل شبلی کے اثر سے اپنے گھر سے زیادہ واقف اور اپنے تہذیبی سرمایے سے زیادہ آشنا ہوگئی، شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (۱۶)

چاہے سائنس کی دنیا میں ہو یا شعر و ادب کی دنیا میں بعض ایسے ذہین لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذکاوت کے ذریعے ایسی صداقت کو اپنی ذہنی گرفت میں لے آتے ہیں جس کا اس وقت وجود نہیں ہوتا لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد آنے والی نسل کے سامنے اس صداقت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ نسل اس صداقت کو پہچاننے میں کامیاب ہوتی ہے، شبلی کا شمار بھی ایسے ہی ذہین لوگوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے مستقبل کو حال کے آئینہ میں دیکھ لیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے جو کیا، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

اسلاف کے کارناموں کا ذکر اور ان پر فخر ہماری سعادت مندی کی علامت ہے، جس طرح مولانا شبلی نے دور ماضی کے اسلاف کا ذکر کرکے ہمارے دلوں کو منور اور دماغ کو معطر کیا، اسی طرح ان کے جذبوں کی قربانی، ان کی فہم و ادراک کی یاد دہانی، بصیرتوں اور خوبیوں کا ذکر بھی ضروری ہے مگر دیکھنا یہ ہوگا کہ ہم اس ذکر سے کچھ نتایج بھی اخذ کررہے ہیں کہ نہیں، اگر نتایج مثبت ہیں تو ہمارے لیے باعث طمانیت ہوں گے اور اگر ہم ایسا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو مولانا شبلی کے پیرو کار ہونے کا دعوا بے معنی ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں لکھا جاچکا ہے کہ شبلی کا عہد ہمارے عہد سے بہت مختلف اس معنی میں نہیں تھا کہ اس وقت بھی مسلمانان ہند نامساعد حالات کا شکار تھے اور آج بھی بے شمار مسایل کا شکار ہیں، اس وقت غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور غیر ملکی حکم رانوں کے ظلم و جبر کا براہ راست نشانہ بنے ہوئے تھے، اس وقت اپنے حوصلوں کو بلند رکھتے ہوئے آگے کی طرف بڑھتے رہنا

ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا جس کی علامت بن کر علامہ شبلی ابھرے، آج ہم آزاد ہیں، اقلیت میں ہونے کی وجہ سے متضاد مسایل میں الجھے ہوئے ہیں، ان میں چند ایسے جو حکم راں طبقہ کی کم نظری کا نتیجہ ہیں اور چند کے ذمہ دار ہم خود ہیں، اس دور ابتلا میں بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے ہمارے حوصلے پست ہوجاتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہم مولانا شبلی جیسی شخصیت کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

مولانا شبلی کی روح کو سکون پہنچانا ہے تو اس اسلامی تشخص پر نظر رکھنی ہوگی جس کی وکالت انہوں نے زندگی بھر کی، ہم کو شدت سے خود احتسابی کی ضرورت ہے، ہم کو سوچنا چاہیے کہ مولانا شبلی کی تعلیمات سے ہمیں جو کچھ ملا ہے اس کا اطلاق اپنی زندگی میں ہم کس طرح کر رہے ہیں، ہم اپنی اگلی نسل کے اندر صالح جذبہ پیدا کررہے ہیں کہ نہیں، اس کے اندر یقین اور اعتماد کی روح پھونک رہے ہیں کہ نہیں، اس کے اندر ڈاکٹر اور انجینئر سے زیادہ ایک اچھا انسان بننے کی خواہش ابھار رہے ہیں کہ نہیں، دراصل یہی فکر مولانا شبلی کے مشن کو باقی رکھے گی، ہماری قوم کے بلند حوصلے کو باقی رکھے گی اور خود ہمارے وجود کو باقی رکھے گی۔

مولانا شبلی کی داستانِ حیات اس مرد مومن کی عملی تفسیر ہے جس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں، انہوں نے سارے اعمال و افکار اور اذہان و قلوب کو اپنی جاوداں تحریروں سے نہ صرف اپنے زمانے میں متاثر کیا بلکہ آج بھی کررہی ہیں، عظیم مصنفین کا فیض صرف اپنے زمانے تک محدود نہیں رہا بلکہ آنے والی نسلوں تک جاری و ساری رہتا ہے، مولانا شبلی کا فیضان آج بھی جاری و ساری ہے اور ان کے زریں کارناموں کی معنویت آج بھی قایم و دایم ہے اور انشاء اللہ ابد الآباد تک قایم رہے گی۔

حواشی و حوالے

(۱) سید سلیمان ندوی، ''علامہ شبلی نعمانی''، مطبوعہ زمین دار، لاہور، یہ مضمون ۱۹۱۴ء کے اواخر اور ۱۹۱۵ء کے شروع میں علامہ کے سانحہ ارتحال کے موقع پر کئی نمبروں میں شایع ہوا تھا اور بعد میں اگست ۱۹۱۶ء کے ''معارف'' میں شایع ہوا۔ (۲) سید سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' معارف پریس، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی،

اعظم گڈھ، مطبوعہ ۱۹۹۳ء، ص ۱۰-۹، (اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۲رفروری ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا تھا)۔ (۳) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مضمون ''شبلی - ایک جامع الحیثیات شخصیت'' ماخوذ از مقالات شبلی، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۱۰، لاہور۔ (۴) ایضاً ص ۱۱۔ (۵) ڈاکٹر سید عبداللہ ''سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جایزہ''، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی ۶، ص ۱۹۵، ستمبر ۱۹۶۱ء۔ (۶) جناب سید حامد ''علامہ شبلی نعمانی، عالم و ادیب، ہماری زبان، دہلی شبلی نمبر''، ۱۵ر- ۲۲راپریل ۱۹۹۵ء، شمارہ نمبر ۱۵-۱۶، جلد نمبر ۵۴، ص ۳۔ (۷) آل احمد سرور ''دیباچہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' مصنفہ عبداللطیف اعظمی، ص ۱۶، مطبوعہ ۱۹۴۵ء، شبلی اکادمی، دہلی۔ (۸) مولانا عبدالماجد دریا آبادی ''معاصرین'' ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، ۱۹۷۹ء، ص ۶۶-۷۰-۷۱۔ (۹) ڈاکٹر سید عبداللہ ''سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا''، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی ۶، ص ۱۰۴۔ (۱۰) سید سلیمان ندوی، مرتب ''مکاتیب شبلی''، جلد اول، ص ۵، دارالمصنفین، معارف پریس، اعظم گڈہ۔ (۱۱) پروفیسر آل احمد سرور ''تنقید کیا ہے''، مضمون ''علامہ شبلی میری نظر میں''، ص ۲۱۲۔ (۱۲) ایضاً ص ۲۱۳۔ (۱۳) پروفیسر آفتاب احمد صدیقی ''شبلی - ایک دبستان''، مکتبہ عارفین ۱۴۵، نیو مارکیٹ، عظیم پور، ڈھاکہ، ۱۹۵۳ء، ص ۲۶۸-۲۶۷۔ (۱۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن ''مولانا شبلی، ایک نظر میں''، معارف پریس، دارالمصنفین، اعظم گڈہ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۶-۱۴۵۔ (۱۵) پروفیسر آل احمد سرور ''تنقید کیا ہے''، ''مضمون ''علامہ شبلی میری نظر میں''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، جولائی ۱۹۷۲ء، ص ۸۲۔ (۱۶) پروفیسر آل احمد سرور ''تنقید کیا ہے''، ''مضمون ''علامہ شبلی میری نظر میں''، کتابی دنیا، دہلی، ص ۲۲۴-۲۲۳۔

⁂⁂⁂

حیات شبلیؒ

از:- مولانا سید سلیمان ندویؒ

اس میں شمس العلما مولانا شبلیؒ کے سوانح حیات اور علمی و عملی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

قیمت: ۱۶۰ر روپے

تہذیب اسلامی، حدیث، تصوف اور شاہ ولی اللہؒ

از:- جناب حیات عامر حسینی صاحب ☆

''اس مضمون کے بعض مندرجات تنجلک اور غور طلب ہیں، مثلاً کتاب و سنت کی دینی اہمیت بیان کرتے ہوئے انہوں نے توازن کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، مقالہ نگار نے سنت و حدیث میں فرق بھی نہیں کیا ہے، تصوف وصول الی اللہ کا ایک طریقہ ہے جو صلحا نے اختیار کیا تھا، اس کو کتاب و سنت سے ثابت کرنے میں مقالہ نگار کامیاب نہیں ہوئے ہیں''۔ (ض)

حدیث اور تصوف کے تعلق کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کس حیثیت سے سمجھا اور دیکھا ہے، اسے جاننے کے لیے تصوف و توحید کا تعلق بھی معلوم کرنا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ تصوف رسول و نبی کی تعلیمات سے کس سطح پر جڑا ہوا ہے، نبی اور رسول نے حسن تہذیب و تمدن کو برپا کیا ہے، تصوف اس سے پیوستہ ہے یا کوئی خارجی شے ہے جسے حالات زمانہ نے اسلام کی عظیم الشان عمارت سے جوڑ دیا ہے، ہمیں اپنی عینک سے اور اپنے اسی معیار و اقدار کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا جو ہماری تہذیب کی بنیاد ہیں، غیروں کی عینک سے دیکھنے کا مرض ہماری اجتماعی و انفرادی زندگی کے لیے سم قاتل ہے، اسی سے ہمارا رشتہ، ہماری تہذیب، تاریخ اور ہمارے فکری و تہذیبی دھاروں سے یا تو کٹ گیا ہے یا بے حد کمزور ہو گیا ہے، ایک قوم کی تاریخ اس کی سب سے بڑی متاع ہوتی ہے، یہ اس کا حافظہ ہوتی ہے اور اسی میں اور اسی کے ساتھ اس تہذیب کے ماننے والوں کے اجتماعی و انفرادی شعور کے تار جڑے ہوتے ہیں، یہ بات اس

☆ شعبہ فلسفہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

ضرورت اور حقیقت کو لازم کرتی ہے کہ توحید اور نبوت کو ان کے اصل معانی میں سمجھا جائے۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان اہم مسایل پر غور کریں، تہذیب و تمدن کے متعلق کچھ باتیں جان لینا ضروری ہے۔

تہذیب و تمدن انسانی زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے، عبادات سے لے کر معاملات تک ہر شعبہ اس کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے اور یہی شعبے مل کر تمدن کی عمارت کو ترتیب دیتے ہیں۔

ہر تہذیب و تمدن کی اپنی ایک یا کئی واضح بنیادیں ہوتی ہیں اور ان کے اپنے اصول و اقدار ہوتے ہیں، کوئی بھی تہذیب و تمدن ان کے بغیر نہ بن سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے، ہر تہذیب و تمدن زندگی کی طرح مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتا ہے، جب تک اس کی بنیادیں اور قوی (شعبے) مضبوط اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں تب تک یہ تہذیب و تمدن قایم رہتا ہے اور جب یہ رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، قرآن پاک میں تہذیبوں کے عروج و زوال پر جو تعلیمات ملتی ہیں ان کے دو اہم اصول یہ ہیں، ۱- نبوت و رسالت پر ایمان اور رسول کی ہدایات و احکام کے مطابق زندگی گزارنا، ۲- اور ان اخلاقی اقدار، اصولوں اور تعلیمات پر عمل پیرا ہونا جو نبوت کا خاصہ ہیں، ان دو اصولوں سے انحراف اور ان کا انکار افراد و اقوام کے تنزل، تباہی اور خاتمے پر منتج ہوتا ہے، اس ضمن میں صالح، ہود، ثمود، لوط اور یہود قوم کی مثالیں واضح ہیں۔

تہذیب و تمدن کا وجود کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، یہ انسانی وجود اور عمل کا لازمہ ہے، کیونکہ انسان ایک مستقل آزادانہ وجود ہے، جسے قدرت نے عقل و شعور کے ساتھ ساتھ جسمانی، نفسیاتی اور روحانی خواہشات، اوراک کی قوتیں عطا کی ہیں اور اسے تمام مخلوق پر تفوق اور فضیلت عطا کی ہے۔

تہذیب و تمدن کی دو قسمیں ہیں: ۱- توحیدی تہذیب ۲- اور مشرکانہ تہذیب۔

توحیدی تہذیب توحیدی تہذیب کی بنیاد توحید کے اصول اساسی پر ہے اور اس کی تعمیر نبوت کے عظیم ہاتھوں سے ہوتی ہے، نبوت توحید کا لازمہ ہے، کیونکہ اس کے بغیر خدا کی وحدانیت کا شعوری ادراک اور ابلاغ ممکن نہیں، معاد، وحدت انسان اور عدل اس تہذیب کے وہ زریں اصول ہیں جو اس کے ستون بھی ہیں اور دیواریں بھی اور چھت بھی۔

توحیدی تہذیب ایک روحانی تہذیب ہوتی ہے، اس کو پیغمبرانہ تہذیب کہہ سکتے ہیں،

کیونکہ اس کے اصول اساسی روحانی ہیں اور اس کے تمام شعبے اور اعمال ایک پیغمبر کے مرتب کردہ ہوتے ہیں اور اس کے تمام اعمال اور تمناؤں کا مرکز خدا کی رضا ہوتی ہے لیکن یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس تہذیب میں روح اور مادہ کی کوئی تفریق نہیں، دینی اور دنیوی زندگی ایک ہی تسلسل کا نام ہے، کیونکہ زندگی خدا کی صفت ہے اور تخلیق بھی، کسی عمل اور کسی شے میں کوئی برائی یا بدصورتی نہیں، معاملہ صرف خالق کی فرماں برداری کا ہے جو کسی شے کو اچھا اور کسی کو برا بنا دیتی ہے، یہ تہذیب خدا کی فرماں برداری کا ایک اظہار ہے۔

مشرکانہ تہذیب پیغمبر کے وجود اور اس کی تعلیمات سے منکر تہذیب مشرکانہ تہذیب ہے، اس کی بنیاد اور ڈھانچہ خدا سے بغاوت، انسانیت کشی، عدم مساوات اور ہمہ جہت استحصال اور ظلم و جبر پر مشتمل ہے، اس تہذیب کا خالق ابلیس ہے، جو خدا کا اولین باغی اور تمام باغیوں کا سرغنہ ہے۔

یہ تہذیبوں کے دو نظام ہیں اور ان کے درمیان ٹکراؤ تخلیق آدم سے شروع ہوا جو قیامت تک جاری رہے گا، کیونکہ آدم خدا کے خلیفہ اور اس کے پیغمبر تھے اور شیطان خدا کا باغی اور انسان کا دشمن، یہ دشمنی جاری رہے گی۔

توحیدی تہذیب، نیکی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اعلا روحانی اور اخلاقی اصولوں کی پرداخت کرتی ہے اور مشرکانہ تہذیب ظلم و جبر اور تمام غیر اخلاقی اور سفلی اصولوں کی، یہ مابعد الطرفین کا فرق ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا، دو متوازی خطوط کہیں پر نہیں ملتے، یہی اصول بھی ہے اور حقیقت بھی۔

توحیدی یا اسلامی تہذیب کی اساس توحید اور نبوت ہے، نبوت توحید کا جز و لاینفک ہے، نبی بندوں اور خدا کے درمیان واحد رشتہ ہوتا ہے، وہی توحید کا مبلغ اور اس کا شارح ہوتا ہے، وہی اس کی نظری و عملی سطحوں کو زندگی کے اعمال کے ذریعہ ایک تہذیب کی صورت گری کرتا ہے۔

توحید اسلامی تہذیب کی اساس اور اس کی نظری بنیاد ہے اور نبوت اس کی فکری اور عملی اساس بھی ہے اور صورت گری بھی۔

یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ رسول کی حیثیت محض فرستادہ اور مبلغ کی نہیں ہوتی، وہ کوئی ڈاکیہ نہیں ہے، اس کی حیثیت کو دو سطحوں پر سمجھنے کی ضرورت ہے:

۱- کفار ومشرکین سے متعلق اس کی ذمہ داری ۲- مومنین سے اس کا تعلق اور ذمہ داری۔

''منکرین کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری بس اتنی تھی کہ آپ ﷺ ان تک پیغام الٰہی پہنچادیں لیکن مومنین کے معاملے میں آپ ﷺ کی ذمہ داری محض تلاوت آیات نہ تھی، بلکہ تزکیہ اور تربیت اور تعلیمِ کتاب وحکمت بھی تھی''۔(۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا، جب کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔(۲)

نبی کی تعلیم جامع ہوتی ہے، وہ محض انفرادی تربیت نہیں کرتا اور نہ وہ محض کچھ اخلاقی اصول واقدار ومحاسن کی تعلیم دیتا ہے، اس کی تعلیم افراد وجماعت دونوں پر محیط ہوتی ہے، وہ اسلام کی اصل اور اس کے سب سے اہم مابعد الطبعیاتی اصول یعنی توحید کی تعلیم دیتا ہے اور اسی کی بنیاد پر تیار ہونے والے افراد کے ساتھ اور اٹھنے والی اس اجتماعیت کی تعلیم وتنظیم اور تطہیر کرتا ہے جسے ہم اسلامی تہذیب اور خلافت الٰہیہ کہتے ہیں، رسول کا ہر عمل اور ہر بات من جانب اللہ یا اس کی تشریح وتوضیح اور اس کا عملی اطلاق ہے، یوں توحیدی تہذیب سنت نبوی اور اسوۂ حسنہ سے تشکیل پاتی ہے، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک حقیقی اسلامی یا توحیدی تہذیب آپ ﷺ کی ہی سنت کا فکری، نظری، عملی اظہار ہے۔

میں اسی حیثیت سے تصوف کو رسالت ونبوت کی تعلیمات سے منسلک مانتا ہوں، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ایک تہذیب محض اساطیر یا بے جان، افراد اور کہانیوں کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ معتقدات اور تاریخ جو اس کی فکری ونظری بنیادوں میں پیوستہ ہوتے ہیں، ان کا نہ صرف وہ مجموعہ ہوتی ہے بلکہ ان کا عملی اظہار ہوتی ہے، تاریخ ان ہی معتقدات کے فکری، عملی اور شعوری وغیر شعوری تسلسل Continuity کا نام ہے، یہی افکار واعمال اس کی اخلاقی، معاشی، سیاسی اور سماجی اعمال کی صورت گری کرتے ہیں اور ان کا تحفظ بھی، کیونکہ جب تک ایک تہذیب کی فکری اساس اور ڈھانچہ زندہ اور موجود ہے، وہ اسطور نہیں بنتی بلکہ دنیا کی تہذیبی وفکری وعملی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

اس بحث سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلامی تہذیب ان علوم ومعارف کا نام

بھی ہے جن سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے سبب امت مسلمہ آراستہ ہوئی اور ان علوم ومعارف اور اس طریقۂ زندگی کا نام بھی جو آپ ﷺ کی سنت عالی شان کے چشمۂ مصفّی سے جاری ہوئے۔

اسلامی تہذیب کے وجود، معانی، ضرورت اور خصائص کے بارے میں اٹھنے والے یا اٹھائے جانے والے سوالات تین وجوہ سے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے اندر بالخصوص اور غیر مسلموں میں بالعموم بے معنی خدشات اور شکوک وشبہات کو جنم دیتے ہیں، یہ وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- رسول کی ذات، صفات اور اس کے منصب کی غلط فہم۔

۲- اسلام کے اساسی اصولوں اور تقاضوں کی غلط یا سطحی فہم۔

۳- کفر والحاد اور مغرب زدگی کے اثرات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذہنی وفکری مرعوبیت جو بالآخر اسلام اور اسلامی تہذیب کی غلط اور لایعنی توجیہات یا اس سے کنارہ کشی پر منتج ہوتی ہے۔

یہاں پر دو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱- رسول کا منصب کیا ہے؟ ۲- کیا ہدایت کے لیے محض اللہ کی کتاب کافی نہیں؟

انسان کی ہدایت محض کتاب سے نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی ہے، اس کے جسمانی، روحانی، نفسیاتی، سماجی ساخت، تقاضے اور مسایل ومعاملات ہمیشہ ایک حرکی ہدایت کے محتاج رہے ہیں اور اس ہدایت کے لیے محض ہدایت نامہ یا کتاب کافی نہیں، ضروری ہے کہ ان کے درمیان ایک ایسا شخص ہو جو اس ہدایت کا حامل بھی ہو اور اس کی عملی شکل بھی، جو اپنی شخصیت اور اعمال کے ذریعہ ان پر اثر انداز ہو، جو ان کی تطہیر کرسکے، جو ان کے دنیوی واخروی معاملات کو سنبھال سکے، جو انہیں اپنے عمل سے اس راہ پر گامزن کرسکے جو ان کی ہمہ جہت فلاح وکامیابی پر منتج ہو۔

ظاہر ہے ایسی شخصیات غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی حامل ہوتی ہیں، عصمت ان کا خاصہ ہوتی ہے، وہ جسمانی وروحانی یعنی ہر لحاظ سے کامل ہوتی ہیں، حق وباطل میں فرق کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے، یہ صفت ان کی فطرت میں ہوتی ہے، وہی حق وباطل کا معیار بھی ہیں، وہ علم، حکمت، طہارت اور حکم سے مزین ہوتی ہیں؛ ان کی بصیرت بے مثل ہوتی ہے، ان کی ساری زندگی پاکیزگی وطہارت کا انتہائی اعلا نمونہ اور معیار ہوتی ہے، انہیں خدا کی طرف سے نہ صرف

غیر معمولی دانش وبینش اور حکمت عطا کی جاتی ہے بلکہ وہ ہمہ وقت خدا کی حفاظت میں ہوتی ہیں، ان سے دانستہ یا نادانستہ کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ کہتے یا کرتے ہیں وہ رب کی طرف سے ان پر وحی کیا جاتا ہے۔

"(اے نبی) کہو میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن راستے پر ہوں"۔(۳)

"اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ (حکم) اور علم عطا کیا"۔(۴)

"تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک اسوہ (نمونہ تقلید) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا خوف رکھتا ہے"۔(۵)

"(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو"۔(۶)

"وہ انہیں معروف کا حکم دیتا ہے اور ان کو منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندشن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے"۔(۷)

قرآن کریم کی آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ نبی کا کام تین واضح خطوط پر ہوتا ہے:

۱-لوگوں کو کتاب اور احکام وقوانین الٰہی کی تعلیم دینا۔

۲-انہیں حکمت کی تعلیم دینا تاکہ فکر وعمل میں صحیح رویہ اختیار کریں اور حقایق کو سمجھ سکیں۔

۳-لوگوں کا تزکیہ کرکے ان کے نفوس سے تمام انفرادی واجتماعی خرابیوں کو دور کرکے ایک صالح اجتماعی نظام کو وجود میں لانا جو انسانیت کے لیے سراپا رحمت ہے۔

لہذا نبی کا فرض منصبی محض کتاب لانا نہیں، وہ اللہ کی طرف سے انسانیت کے لیے معلم، مربی، ہادی، شارع، قاضی اور حاکم یعنی سب کچھ ہے اور اس کی زندگی مومنین کے لیے اسوۂ کامل ہے۔

(اے نبی، لوگوں سے) کہو: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔(۸)

(اے نبی) کہو: اطاعت کرو اللہ اور (اس کے) رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو

اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔(۹)

انسان عقل، فہم وفراست، شعور اور دیگر روحانی وجسمانی قویٰ میں ایک مرتبہ کے نہیں ہیں، اگر انہیں محض ایک کتاب دی جاتی تو وہ اس کی اپنی فہم، پسند اور اغراض ومقاصد کے تحت تشریح کرتے، وہ احکام الٰہی کے حقیقی منشا اور مفہوم کو سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور ان ہی غلطیوں کے مطابق اپنے معاملات چلاتے، اختلافات کا ایک طوفان پیدا ہوتا، کون ہوتا جو ان کو صحیح حقایق بتا دیتا اور ان کے اختلافات میں فیصلہ کرتا، ظاہر ہے کہ مجرد کتاب ان کے لیے ہدایت کے بجائے ضلالت وگم راہی بن جاتی۔

خدا کی ہدایت یعنی کتاب بن مانجھی کے ناؤ نہیں ہوسکتی اور نہ ایسا ہے، اسے پہنچانے اور اس کے معارف ومعانی کے بیان اور اس کے عملی اطلاق کے لیے ایک وجود مطہر کی ضرورت ہے جسے رسول یا نبی کہتے ہیں۔

عملاً یہ بھی ہے کہ خدا کی کتاب اس کے فرامین کا ایک مجمل خاکہ ہوتی ہے، اس کی صحیح تشریح ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ کام وہی کرسکتا ہے جو خدا کا منتخب ہو اور جس کا اس سے تعلق ہو اور جسے اس کی معرفت کاملہ حاصل ہو۔

یوں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ انسان کامل خدا کا رسول ہی ہوسکتا ہے اور کوئی نہیں اور اس کا ہر قول وعمل خدا کی کتاب کی عملی تفسیر ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔

"(اے نبی) ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے اس تعلیم کو واضح کرو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے"۔(۱۰)

اس بحث سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کتاب کو سنت کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی کہ سنت کو کتاب کی حاجت ہے۔

قرآن پاک کی مختلف آیات کریمہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن مجمل ہے اور حدیث اس کی شرح وتفسیر ہے اور مبین ہمیشہ مجمل پر مقدم ہوتا ہے، یہ بیان تفسیر البیان میں ہے، سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ "بعض مقامات پر قرآن کا بیان اتنا مجمل ہے کہ حدیث کے بغیر اس کا اجمالی حکم پر عمل کرنا مشکل ہے"۔(۱۱)

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی معرفت رسول کی ذات اقدس کے بغیر ایک گم راہ کن اور ڈراونے خواب کے سوا کچھ نہیں۔

حدیث یا سنت رسول کو ترک کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے اور اسے ایک آوارہ جانور یا ایسی حویلی بنادیا جائے جس کا کوئی مالک نہیں، کیونکہ سنت نبوی کے ترک کرنے یا غیر ضروری سمجھنے کا اس کے سوا اور کوئی مطلب اور نتیجہ سامنے نہیں آتا کہ نہ صرف اسلام کا سماجی، معاشی وسیاسی نظام ایک بے معنی لفظ بن جاتا ہے بلکہ اس کے مابعد الطبعیاتی، اخلاقی اور عباداتی نظام کے تانے بانے بکھر کے رہ جاتے ہیں، قرآن کی کسی آیت کی کوئی بھی تشریح پھر کیسے کی جاسکتی ہے، پھر تو قرآن کی تعلیمات اور تشریحات محض ایک گورکھ دھندا بن جائیں گی، ظاہر ہے کہ سنت کے متعلق ایسا رویہ محض بھٹکے ہوؤں کا ہی ہو سکتا ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے مقام رسالت، سنت نبوی، اتباع سنت اور ان کی اصل حیثیت اور کردار پر روشنی ڈالی ہے اور ان ہی مباحث میں تصوف اور رسالت کے تعلق کو واضح کیا ہے، اس کا ایک مختصر خاکہ یوں ہے۔

توحید خدا کی وحدانیت کا اقرار ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ تسلیم کرلے کہ خدا کی ذات، صفات، حقوق اور اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں، وہی تمام کائنات کا خالق ہے اور وہی تمام عبادات کا مستحق ہے، خدا نے انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تاکہ وہ اس کی عبادت کرے اور اس کی مرضی کے مطابق اس دنیا کی تعمیر کرے، یہ اسلام کا اصول اساسی ہے، اسی پر اسلام کی ساری عمارت کھڑی ہے، انسان کے تمام نیک اعمال کا مبدأ توحید ہی ہے، توحید پر ایمان کے بغیر تمام نیک اعمال کی کوئی حیثیت نہیں، کیونکہ توحید اسلام کا اصول اساسی ہے اور اسی پر اس کی ساری عمارت استوار ہے۔

توحید کا لازمی تقاضا نبوت ہے، اگر کوئی توحید پر ایمان رکھتا ہو لیکن نبوت کو تسلیم نہ کرتا ہو تو اس کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ نبی خدا کا فرستادہ اور اس کی ہدایت، تعلیمات اور احکام کا عملی نمونہ ہوتا ہے، وہ اس زمین پر خدا کا حقیقی خلیفہ اور نمایندہ ہے، وہی رہنمائی کے قوانین کو خوب جانتا ہے، خدا کا یہ فرستادہ واقف اسرار الٰہی ہے، اسے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا

جاتا ہے، وہی انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے، وہ فی نفسہ معصوم اور بڑا کامل ہوتا ہے، وہ تمدن کی تمام ضرورتوں اور مصلحتوں سے واقف ہوتا ہے، وہ اپنے اعمال واقوال میں ہر خطا اور گم راہی سے محفوظ اور پاک ہوتا ہے، وہ نہایت زیرک، صاحب کمال اور صاحب عصمت ہوتا ہے، دنیا کو صحیح راستہ پر تعمیر کرنے کے لیے انسانیت کو ہمیشہ ایک ایسے رہبر کامل کی ضرورت ہے جس کی عصمت اور معصومیت پر وہ متفق ہو، سب انسان اس مرتبہ کے نہیں ہو سکتے اور نہ سارے انسان نبی ہو سکتے ہیں، ایسا کہنا تو بڑی بات ہے سوچنا بھی ایک منطقی مغالطہ ہے، سب انسان عقل، فہم وفراست، پاکیزگی، علم، قوت اور دوسرے خصائل میں چاہے اچھے ہوں کہ برے ایک جیسے نہیں ہوتے، وہ مختلف مراتب کے ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے ادراک کی ایک حد معین ہے لیکن ان کے حد ادراک وعقل وفہم سے آگے بھی علوم اسرار ہیں جن کا حصول آسان نہیں، یہ علوم انبیا کو حاصل ہوتے ہیں اور اولیا، اللہ پر انہیں منکشف کیا جاتا ہے، اس لیے ان کی ہمہ جہت ہدایت کے لیے ایک کامل رہبر کی ضرورت ہے، جسے نبی کہا جاتا ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص کا بڑا جامع بیان یوں کیا ہے:

''نبی انسانوں میں سب سے اعلا انسان ہوتا ہے، وہ فہم وفراست میں کامل ہوتا ہے، اس کی ملکی قوت نہایت بلند ہوتی ہے، وہ اللہ کی خواہش سے نظام مقصود کو قایم کرنے کی صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے، اس پر ملأ الٰہیہ سے احوال الٰہیہ نازل ہوتے ہیں، اس کے مزاج میں اعتدال ہوتا ہے، وہ راہ راست کا سب سے زیادہ التزام رکھنے والا، عبادت میں ہمہ وقت مصروف اور لوگوں کے معاملات میں عدل کرنے والا ہوتا ہے، اس کا میلان اور تعلق ہمیشہ عالم غیب سے ہوتا ہے۔

انبیا کے مختلف مدارج ہیں، کوئی حکیم، کوئی خلیفہ، کوئی ہادی ومزکی، کوئی امام اور کوئی منذر ہوتا ہے لیکن حضور ختمی مرتبت ﷺ معظم الشان نبی ہیں، آپ ﷺ میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو جملہ انبیا میں تھیں، آپ ﷺ میں مفہمین کے جمیع فنون موجود ہیں۔

نبی کا وجود اور بعثت انسانوں کی فلاح اور انہیں خسران عظیم سے بچانے کے لیے ہے، لوگ علوم ورضاے الٰہی کا اپنے آپ ادراک نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کا وجود، عقل اور قوی ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں، یہ بھی ہے کہ کچھ ایسے موانع اور مفاسد ہوتے ہیں جو بغیر جبر اور دلیل کے دفع نہیں ہو سکتے

اوران کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کو عذاب دیا جائے، تب بعض اسباب علوی اور سفلی کے جمع ہونے کے بعد لطف خداوندی کا اقتضا ہوتا کہ کسی قوم میں ایک نبی کو مبعوث فرمائے، پس ان کی اصلاح و بہبود کے لیے نبی کی بعثت ہوتی ہے اوران کے حال کی درستی نبی کی غیر مشروط اطاعت میں مضمر ہے، نبی کا وجود اوراس کی غیر مشروط اطاعت یا انکار ہی میں کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا راز مضمر ہوتا ہے، نبی کی بعثت کے ساتھ ہی اس کی قوم پر اس کی پیروی واجب ہوجاتی ہے خواہ وہ راہ راست پر ہی کیوں نہ ہو، نبی کی بعثت ان کی راست روی کا بھی امتحان ہے، نبوت کے انکار سے ان پر تقرب الٰہی کا راستہ بھی بند ہوجاتا ہے، نبی تمام تحریفات کو دور کرکے انسانوں کو صحیح تعلیم الٰہی سے منور کرتا ہے اوران پر حجت قایم کرتا ہے، حکم الٰہی کا ظہور اسی کی ذات میں اورذات سے ہوتا ہے''۔(۱۲)

انبیا علیہم السلام لوگوں سے ان کی عقلوں کے موافق اوران کے علوم کے مناسب جوان کے اندر پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں کلام کرتے ہیں اوران کی تربیت کرتے ہیں، وہ ان کی تہذیب نفس کرتے ہیں اورانہیں ان کی ضروریات کے متعلق دین ودنیا کے اسرار وحقایق سے آگاہ کرتے ہیں، وہ انہیں اعمال وافعال سے مطلع کرتے ہیں جن سے خدا کی رضا اور ناخوشی کا تعلق ہے، یہ اعمال وافعال مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں، ان کا تعلق انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے، یہ عبادات سے لے کر معاملات تک محیط ہوتے ہیں، یہ انفرادی زندگی کی بھی تشکیل، تعمیر اور تحدید کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی کی بھی، ان اعمال کی دو حدیں ہوتی ہیں، ایک اعلا اور دوسری ادنا اوران حدود سے ہی انسان کے اعمال کی درستگی یا نادرستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

نبی پیغام الٰہی کی تبلیغ ہی نہیں کرتا، وہ انسانوں کی تطہیر اور جسم وقلب وروح کا تزکیہ کرتا ہے، وہ احکام الٰہی کی تشریح بھی کرتا ہے اورانہیں بالفعل نافذ بھی کرتا ہے اوراس طرح ایک فلاحی انسانی سماج کی تعمیر کرتا ہے، اس کی ہر بات اور ہر عمل اور ہر حکم خدا کا حکم ہے اوراگر غور سے دیکھا جائے تو پیغمبر کی ہر بات ایک قدر (Value) اور قانون (Law) ہے جس سے انکار یا جس کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے، اس طرح پیغمبر اپنی ذات میں شارح اور شارع ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے اس اہم مسئلے پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''جب کوئی پیغمبر لوگوں میں مبعوث ہوتا ہے تو ہر شے کو اس کی اصلی حالت کی طرف

پھیر لاتا ہے، وہ پہلی شریعت کے احکام میں غور ونظر کرتا ہے، پس ان میں جو امور شعائر اللہ ہوتے ہیں، جن میں شرک کی آمیزش نہیں ہوتی یا عبادت کے طریقے یا انتظامی امور کے طریقے جو مذہبی قوانین کے مطابق ہوتے ہیں، ان سب کو وہ باقی رکھتا ہے اور جو نابود ہوجاتے ہیں، ان کا مہتم بالشان ہونا بتاتا ہے اور ہر شے کے ارکان واسباب بیان کرتا ہے اور تحریف وسستی کے جو امور ہوتے ہیں ان کو دور کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ یہ باتیں مذہب میں سے نہیں ہیں اور جو احکام اس زمانہ کی مصلحتوں پر مبنی تھے پھر اختلاف عادات کی وجہ سے وہ مواقع مصلحت بدل گئے تو ان احکام کو نبی بدل دیتا ہے، کیونکہ احکام کے شروع کرنے سے مقصود اصلی مصلحتیں ہی ہیں، پس حالات کی مصلحت کے لحاظ سے احکام بھی بدل جاتے ہیں اور جو امور ایسے ہیں جن پر ملأ اعلا کا اتفاق اور اجماع ہوگیا ہے، جو ان کے اعمال، عادات، علوم اور نفسانی حالت میں داخل ہیں تو ان امور کو نبی اور زیادہ کر دیتا ہے''۔(۱۳)

نبی ہمہ وقت خدا کی حفاظت اور نگرانی میں ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا یا کرتا ہے، منشائے الٰہی ہوتا ہے، اس لیے اس کی ہر بات اور ہر عمل قانون الٰہی ہے'' اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے''۔(۱۴)

نبی انسانوں کو تعلیم کتاب دیتا ہے اوران کا تزکیہ وتطہیر کرتا ہے، وہ مذہب کی کجی اور تحریفات کو دور کرکے ایک صالح گروہ اور سماج کی تشکیل وتعمیر کرتا ہے۔

یہ باتیں تو انبیا کا خاصہ ہیں، حضرت محمد ﷺ انبیا ومرسلین کے سردار اور خاتم ہیں، اس لیے یہ مشن اپنی کمال شکل میں انہیں پورا کرنا تھا تاکہ قیامت تک وہ مشعل انسانیت بنا رہے۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ نبی ایک سماج اور تہذیب کی نہ صرف بنیاد گزاری کرتا ہے بلکہ اسے اس کی اصل اور مطلوبہ شکل میں سامنے لے آتا ہے، حضور ﷺ نے اس تہذیب کی انتہائی مکمل شکل دنیا کے سامنے رکھ دی، حضرت محدث دہلویؒ نے اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے آپ ﷺ کے منصب نبوت ورسالت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''آں حضرت ﷺ کی بعثت میں ایک دوسری بعثت شامل تھی، ایک بعثت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ بنی اسماعیل کی طرف مبعوث ہوئے، چنانچہ خدا تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے،

"خدا ہی نے امیوں کے لیے ان میں ہی سے ایک شخص کو پیدا کیا" اور خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے" تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباؤ اجداد نہیں ڈرائے گئے تھے، اسی لیے وہ غفلت میں ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ آپ ﷺ کو تمام اہل زمین کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، آپ ﷺ قاطع اور خاتم نبوت و رسالت ہیں، اس لیے آپ ﷺ تمام زمانوں کے لیے پیمبر ہیں۔

پہلی بعثت کا خاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شریعت کا مادہ شعائر اور عبادات اور انتظامی امور کے وہی طریقے ہوں جو بنی اسماعیل کے پاس موجود تھے، کیونکہ پیمبر قوموں کی سابقہ شریعت کی تطہیر و اصلاح بھی کرتا ہے اور انہیں ان کی زبان اور ان کی استعداد، قوی اور کوائف کے مطابق خدا کے احکام کو سمجھاتا، ان کی تشریح کرتا اور ان پر اس کا نفاذ کرتا ہے، کیونکہ شریعت لوگوں کو ان چیزوں کا مکلف نہیں بناتی، جن کو نہ وہ جانتے ہوں اور نہ جن کی ان میں استعداد ہو"۔ (۱۵)

دوسری بعثت کا خاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک نئے اور جامع تمدن کے بنیاد گزار رہیں، جس میں پرانی شریعتوں کی اصل تعلیمات کو شامل کیا گیا ہے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے اصولوں سے مزین کیا گیا ہے، اسی لیے اس بعثت میں وہ علوم اور تدابیر مندرج ہیں جو تمدن سے متعلق ہیں۔

اس بعثت کے لیے ضروری تھا کہ پرانی تہذیبوں اور ان کے نظام کو تتر بتر کر دیا جائے تاکہ ایک نیا دنیوی نظام قائم ہو سکے، اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ایک ایسی جماعت کو تبلیغ و نفاذ شریعت کا مکلف بنا دیا جائے جو نبی کی تربیت یافتہ ہو اور اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ پوری امت کو بھی اس کام کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو ایک مکمل اور جامع کتاب و شریعت دی گئی اور آپ ﷺ کی ذات اقدس کو وہ کمالات اور غلبہ اور حکمت عطا کی گئی جو کامل و جامع ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے اس نکتہ کی مزید تشریح یوں کی ہے:

"خداوند عالم نے ارادہ کیا کہ مذہب کی کجی دور کر دے اور لوگوں کے لیے ایسا گروہ پیدا کر دے جو لوگوں کو نیک امور بتلائے اور برائیوں سے روکے اور لوگوں کی خراب رسموں کو بدل دے تو ایسا انتظام دونوں (قدیم مجوسی اور نصرانی حکومتوں اور تہذیبوں یعنی روم و ایران) دولتوں

کے زوال پر موقوف تھا اور ان دونوں سلطنتوں کے حال پر تعرض کرنے سے بہ سہولت حاصل ہو سکتا تھا، کیونکہ ان ہی کی حالتیں تمام عمدہ ملکوں میں سرایت کر گئی تھیں یا سرایت کرنے کے قریب تھیں، اس واسطے خدا تعالیٰ نے ان دونوں سلطنتوں کا زوال مقدر کر دیا اور اس حق کو نازل کیا جو تمام دنیا کی بیہودگی کو دور کر دے، اس طور سے نبی ﷺ اور صحابہؓ کے ذریعہ عرب کی اصلاح کی گئی اور عرب کے ذریعے ان دونوں سلطنتوں کی بیہودگی رفع کی جائے اور پھر دونوں کے ذریعہ سے تمام عالم کو دروغ اور ناراستی سے پاک صاف کر دیا جائے"۔ (۱۶)

ایک عالمی، دائمی اور آخری نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر "لوگوں کو راہ راست کی طرف بلائے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کی حالت کو درست کرے، پھر ان کو بہ منزلہ اپنے اعضا کے بنالے تاکہ ان کے ذریعے تمام عالم میں جہاد کرے اور ان کو دنیا میں پھیلا دے، چنانچہ خدا کے اس قول میں یہی مراد ہے" تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی تکمیل کے لیے پیدا کیے گئے ہو" اور یہ اس لیے کہ یہ امام خدا تنہا بے شمار قوموں سے جہاد نہیں کر سکتا، اس نبوت و شریعت کا جامع ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسے قیامت تک تمام لوگوں کی رہبری کرنی ہے اور اس مذہب کا طبعی مذہب ہونا ضروری ہے تاکہ یہ تمام لوگوں کی فطرت کے مطابق ہو اور ان پر محیط ہو"۔ (۱۷)

نبی آخر الزمان ﷺ کی لائی ہوئی کتاب آخری کتاب ہے اور آپ ﷺ کی شریعت ایک مکمل اور جامع شریعت ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نبی کی موجودگی میں کسی بھی شخص یا ادارے کو کوئی تشریحی اختیارات حاصل نہیں، کیونکہ نبی خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اور اسی حیثیت میں وہ قانون کا مصدر و مرکز ہوتا ہے، وہی قانون الٰہی لاتا ہے، اس کی تشریح و تعبیر و تبلیغ کے ساتھ اس کا نفاذ کرتا ہے اور انسانی سماج کی ضروریات کے مطابق قانون سازی کرتا ہے، وہی تمام سیاسی و اخلاقی اور معاشی و سماجی اصولوں کی تطہیر کرتا ہے اور نئے قوانین اور اصول دیتا ہے۔

لیکن نبی ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد چونکہ پوری امت مسلمہ کو آپ ﷺ کے مشن کی تبلیغ و نفاذ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ہدایت کا ذریعہ یا ذرائع کیا ہیں اور دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہر کوئی اس قانون کی تشریح کا حق رکھتا ہے۔

اس سوال کا جواب خود ہی رسول اکرم ﷺ نے دیا ہے، آپ ﷺ نے خدا کی کتاب اور اپنی سنت کو تمام ہدایت اور قانون کا مصدر فرمایا اور یہ فرمان عظیم الشان بھی خدا کا ہی حکم ہے،

''رسول تمہیں جو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو''۔ (۱۸)

''اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ (۱۹)

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ (۲۰)

قرآن کے متعلق یہ واضح ہے کہ خدا کی یہ کتاب مجمل ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے، اس کی تفصیلات اور تشریح اور نفاذ کے لیے پیغمبر عظیم کو مبعوث کیا گیا، اگر یہ کتاب جملہ تفاصیل کے ساتھ نازل کی جاتی تو یہ اتنی ضخیم وطویل ہو جاتی کہ اس کا حفظ ومذاکرہ مشکل ترین ہو جاتا اور تسہیل وتیسیر کی اس میں جو خوبیاں ہیں وہ باقی نہ رہتیں۔

سنت اس کی تفصیل ہے، سنت آپ ﷺ کے عمل کا نام ہے، یہ آپ ﷺ کے قول، فعل، تقریر اور اجتہاد پر محیط ہے۔

''محدثین کے نزدیک سنت حضور ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات، آپ ﷺ کی ہیئت، صفات خلقیہ، صفات خُلقیہ، شمائل اور ان تمام امور کو کہتے ہیں جو قبل رسالت یا بعد بعثت آپ ﷺ کی طرف منسوب ہوں، خواہ ان سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، حدیث[1] کا لفظ بھی السنۃ ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۲۱)

حضرت محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ تمام علوم یقینیہ اور فنون کا سرچشمہ علم حدیث ہے جس میں جناب افضل المرسلین علیہ السلام کے قول وفعل اور تقریر کا بیان ہوتا ہے (۲۲) اور دین کا انتظام نبی ﷺ کے اتباع پر موقوف ہے (۲۳) اور یہ بھی کہ ''واضح ہو کہ ہمارے پاس آں حضرت ﷺ کی حدیث کے سوا کوئی ذریعہ شرائع اور احکام کے معلوم کرنے کا نہیں''۔ (۲۴)

''واضح ہو کہ جو کچھ نبی ﷺ سے مروی ہے اور کتب حدیث میں مدون ہے، اس کی دو قسمیں ہیں اور وہ امور جن کا ذریعہ تبلیغ رسالت ہے، اس سے متعلق خدا کا تعالیٰ کا یہ قول ہے

۱ حدیث اور سنت میں بڑا فرق ہے۔ ''ض''

''پیغمبر جو کچھ تم کو بتائے اس کی تعمیل کرو اور جس سے منع کرے اس سے باز آجاؤ، من جملہ ان کے وہ احادیث ہیں جن میں عالم معاد کے واقعات وکوائف اور عالم ملکوت کے عجائب کا ذکر ہے۔

اور ان ساری احادیث کی بنا وحی پر ہے اور اسی قسم میں سے وہ حدیثیں ہیں جن میں احکام وشرائع کا بیان ہے، عبادت کے ارکان وآداب کی توضیح ہے اور ارتفاقات سے متعلق امور کا بیان ہے، ان میں سے کچھ احادیث کی بنا وحی پر ہے اور کچھ ایسی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر مبنی ہیں لیکن یاد رکھو کہ نبی ﷺ کا اجتہاد بھی بہ منزلہ وحی کے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ آپ ﷺ کی رائے خطا پر قایم ہو۔

اور ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ دیگر مجتہدین کی طرح آپ ﷺ کا اجتہاد بھی منصوص حکم سے استنباط کردہ ہو، جیسا کہ بعض گمان کرتے ہیں بلکہ آپ ﷺ کے اکثر اجتہادات کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مقاصد شریعت اور قانون سازی کا ضابطہ اور تیسیر کے اصول کی تعلیم دی اور احکام مرتب کرنے کا اختیار دے دیا، تو آپ ﷺ نے ان مقاصد کو بیان فرما دیا جو آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوئے اور جن کا تعلق قانون تشریع اور تیسیر اور احکام سے تھا''۔ (۲۵)

یہ سنت نبوی سے متعلق حضرت محدث دہلویؒ کی گفتگو ہے، لیکن حدیث کے ذیل میں ہی آپ ﷺ نے اس سوال کا بھی جواب دیا ہے کہ امت محمدیہ کو کس طرح کا حق اجتہاد حاصل ہے، آپ کے خیال میں ''شارع نے ہم کو دو قسم کے علمی فائدے پہنچائے ہیں جن کے احکام اور مراتب جدا جدا ہیں، پس ان میں سے ایک قسم مصالح اور مفاسد کا علم ہے یعنی جس میں نفس کو مہذب کرنے کا بیان ہے، اس طور پر کہ وہ اخلاق جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں حاصل کیے جائیں اور ان کے مخالف اخلاق کو دور کیا جائے اور جس میں تدبیر خانہ داری، آداب معاش اور سیاست مدینہ کا بیان ہے۔ جن کی شارع نے نہ مقدار معین کی اور نہ کسی مبہم کو حدود کے ساتھ منضبط کیا اور نہ ہی علامات معلومہ کے ساتھ کسی قابل اشکال امر کو ممتاز کیا بلکہ پسندیدہ اور معروف امور کی ترغیب دی اور رذائل سے کنارہ کش رہنے کی ہدایات فرما دی اور اپنے کلام کو اہل زبان کے فہم پر چھوڑ دیا، جس مصلحت کی شرع نے ہم کو ترغیب دی ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے اس کی انتہا ان تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے، ان میں اول ان چار خصلتوں کے ذریعہ نفس کو مہذب

کرنا ہے جو آخرت میں نفع بخش ہوں یا ان تمام خصائل سے نفس کو مہذب کرنا ہے جو دنیا میں مفید ہوں، دوم کلمۃ اللہ کا بلند، شرائع کا مستحکم کرنا اور ان کی اشاعت میں سعی کرنا، سوم لوگوں کی حالت کا انتظام کرنا، ان کی تدابیر کو درست کرنا اور ان کی رسوم کو مہذب صورت میں لانا ہے۔(۲۶)

ارتقا ہر آن اور ہر سو جاری ہے، اس بنیادی حقیقت کو اسلام نے کہیں نظر انداز نہیں کیا، کیونکہ ایک فطری مذہب ایسا نہیں کرسکتا اور نہ ایسا کرنے کا متحمل ہوسکتا ہے، اسی لیے شریعت مطہرہ کی تشریح وتعبیر میں مسلمانوں کو ایک خاص اور محدود آزادی عطا کی گئی، یہ آزادی قرآن وحدیث کی روح سے مشروط ہے، حالات زمانہ اور علوم تمدن کے ارتقا کے مطابق شریعت کے کچھ حصوں کی تشریح وتعبیر کا اختیار امت مسلمہ کو دیا گیا تاکہ اسلامی تہذیب ایک زندہ اور حرکی تہذیب وتمدن کی حیثیت سے زندہ بھی رہے اور ترقی بھی کرتی رہے اور اس عمل میں وہ شریعت مطہرہ سے ہدایت (Guidance) بھی لیتی رہے، یہ ہے اصل روح اجتہاد، جو شریعت مطہرہ کا حکم اور اس کی جان ہے۔

اب ہمارے سامنے جو اہم سوالات پیدا ہوجاتے ہیں وہ تصوف اور حدیث کے باہمی تعلق کے حوالے سے ہیں۔

کیا تصوف کی بنیاد سنت نبوی ﷺ ہے؟

کیا تصوف دنیا سے علاحدگی اور کنارہ کشی کا نام ہے، اگر ایسا ہے تو کیا پھر کار نبوت کے تبلیغ ونفاذ کی جو ذمہ داری امت مسلمہ پر رکھی گئی ہے، یہ اس سے انحراف نہیں ہے؟

کیا تصوف کسی تہذیب کو جنم دے سکتا ہے یا اس کے ارتقا میں کوئی کردار ادا کرسکتا ہے؟

ان تین اہم سوالات کا جواب ہم تاریخ اسلام میں بالعموم اور حضرت محدث دہلویؒ کی تعلیمات میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

ہم اس دعوا سے اس بحث کا آغاز کر رہے ہیں کہ حضور ﷺ کی زندگی تصوف کی عملی شکل ہے، وہ تمام آداب، اقدار اور خصائص جو تصوف کی نظریاتی وعملی تعلیمات کی شکل ہیں، حضور ﷺ کی زندگی میں نظر آتی ہیں، اس شکل کو ہم مندرجہ ذیل خطوط میں دیکھتے ہیں:

۱-ایمان ۲-عبادت ۳-طہارت ۴-احسان ۵-نیکی اور بدی ۶-اخلاق و اقدار عالیہ ۷-عدل ۸-وحدت انسانیت ۹-سعادت۔

اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان تصوف کا اصل الاصول ہے، اگر کسی شخص کا اللہ یا اس کے رسول پر ایمان نہ ہو تو اس کا صوفی ہونا تو دور کی بات رہی وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے، صوفیا اور ان کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان قدر مشترک توحید اور رسالت ہی ہے، صوفیا کی توحید تو انتہائی درجہ کی خالص توحید ہے، وہ تو اللہ کی ذات کے وجود کے علاوہ کسی کے وجود کو حقیقی تسلیم ہی نہیں کرتے، لا موجود الا اللہ اسی نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے۔

ابوالحسن نوری کے خیال میں صوفی وہ ہے جو غیر اللہ سے بھاگتا ہے، حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمان الٰہی کا ماننے والا ہے، تصوف یہ ہے کہ بغیر علائق کے خدا سے قربت حاصل ہو......اور جن کا قیام اللہ کے ساتھ ہے، حضرت ابوبکر شبلی نے توحید کو ایک منفی استدلال کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے کہ ’’تصوف شرک ہے اس لیے کہ تصوف کے معنی دل کے غیر سے محفوظ رہنے کے ہیں، حالاں کہ غیر کا کوئی وجود ہی نہیں‘‘۔(۲۷)

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہمیشہ صوفیا کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز واحد رہی ہے، یہ صرف صوفیا کا معاملہ نہیں، اسلام کی حقانیت، حقیقت بھی حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذات مقدس سے وابستہ ہے، کیونکہ خدا کو لاشعوری یا شعوری طور پر ماننے والے تو کفار ومشرکین بھی ہیں، لیکن خدا کی حقیقت وحیثیت اصلی، اس کے صفات، حقوق اور اختیارات، انسان اور کائنات کی حقیقت، ان کے حقوق، اختیارات اور ذمہ داریاں اور خدا، کائنات اور انسان کا تعلق ایسے جملہ مسائل وحقائق کی فہم رسول ﷺ کی ذات والاصفات سے ہٹ کر ایک بے معنی گورکھ دھندا بھی ہے اور دین ودنیا کے خسران کا پیش خیمہ بھی اور نتیجہ بھی، یہ خدا کا رسول ہے جو انسان کی ہدایت، معارف کی فہم اور پہچان اور نجات کا واحد ذریعہ ہے، وہی خدا اور انسان کے درمیان واحد اور حقیقی تعلق ہے، اسی لیے قرآن پاک نے آپ ﷺ کی محبت اور اطاعت کو اسلام اور ایمان کا واحد معیار حقیقی قرار دیا ہے، صوفیائے کاملین بھی قرآن پاک کی تعلیمات کے تحت آپ ﷺ کی محبت کو ایمان حقیقی کہتے ہیں۔

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے خدا کے اذن سے''۔ (۲۸)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک اسوہ (نمونہ تقلید) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا خوف رکھتا ہو''۔ (۲۹)

''رسول تمہیں جو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو''۔ (۳۰)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو تو اس کو پھیر دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف، اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو''۔ (۳۱)

''اے نبی (لوگوں سے) کہو: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا''۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے والدین، اولاد اور دنیا بھر کے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں''۔ (۳۲)

صوفیا نے ذات رسول اور آپ ﷺ کی محبت کو تمام علم، معرفت، حقائق اور سعادت کا مرکز اور واحد ذریعہ بتایا، کیونکہ آپ ﷺ کی ذات گرامی سے تمام ہی علوم و معارف و حقائق کے در وا ہوئے اور آپ ہی کی متابعت خدا کی رضا ہے اور اسی سے سعادت یعنی دیدار خداوندی کا حصول ممکن ہے، تمام صوفیا کے مطابق آپ ﷺ ہی انسان کامل، خلیفۃ اللہ، عقل اول، سراج منیر، ابوالارواح، روح اعظم، منطقہ ہیولی، اسرار النقطہ اور حقیقت الحقائق ہیں۔

یہ ساری کائنات آپ ﷺ کے لیے پیدا کی گئی ہے اور تمام ارواح کی تخلیق سے پہلے اللہ نے آپ ﷺ کی روح اعظم کو پیدا فرمایا۔

عبادت سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو، ان کا تعلق انسان کے جسم، مال، روح اور سماج سے ہے لیکن ان تمام اعمال کی بنیاد ایمان اور نیت پر ہے، کیونکہ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہو تو اچھے اعمال کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ تمام نیک

اعمال محض اللہ کی رضا کی حصول کے لیے ہیں اور کافر و مشرک تو خدا کا باغی ہوتا ہے، اس کا رضائے الٰہی سے کیا تعلق؟ دوسرا اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ ایک کافر یا مشرک نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد جیسی عبادات سے ہمیشہ دور ہے، حالاں کہ یہ عبادتیں اسلام کی بنیاد ہیں اور یہی عبادتیں کافر اور مسلمان میں امتیاز کرتی ہیں۔

عبادات تمام طبعی، نفسیاتی اور روحانی حجابات کو دور کرتی ہیں اور بندے کو اللہ کے نزدیک لے آتی ہیں، ان ہی عبادات کے ذریعہ بندہ اپنے نفس کو قابو میں کر لیتا ہے جو صوفیا کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے۔ (۳۳)

نیت قصد اور ارادہ کو کہتے ہیں، یہ تمام عبادات کی علت غائیہ ہے، نیت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب یہ رضائے الٰہی کا حصول ہو یا کسی گناہ کی انجام دہی، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، حضرت محدث دہلویؒ نے اس کی شرح یوں کی ہے:

''اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی تہذیب اور اس کی کجی کے دور کرنے میں اعمال کا کچھ حصہ نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی ایسے مقصد کے تصور کرنے سے صادر نہ ہوں جس کو تہذیب نفس سے تعلق ہوتا ہے اور عادت یا لوگوں کی موافقت یا ریا اور سمعہ یا اقتضائے جبلی کی وجہ سے صادر نہ ہوں'' (۳۴) پس نیت تمام اعمال صالحہ کی بنیاد ہے اور نیک نیتی سے اعمال صالحہ کے کرنے سے رضائے الٰہی اور دیدار الٰہی جسے صوفیا سعادت کہتے ہیں کا حصول ہوتا ہے، اگر نیت صاف نہ ہو تو اعمال اکارت جاتے ہیں اور یوں ایک آدمی اپنی مالی، جسمانی اور نفسیاتی قوتوں کا خود ہی زیاں کرتا ہے اور خدا کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔

طہارت کے معنی پاکی کے ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ وہ وسیع عمل ہے جو لباس، بدن، ماحول، اعمال اور روح کی پاکیزگی پر محیط ہے، تمام عبادات کی بنیاد شرط اور اصل الاصول طہارت ہی ہے، کیونکہ جسم کی ناپاکی اعمال صالحہ اور عبادات کی انجام دہی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لیکن محض جسم کی پاکی عبادتوں کا راستہ نہیں کھولتی، اس کے لیے لباس اور نفس کی پاکیزگی بھی شرط ہے، اگر نیت صاف و پاک نہ ہو تو کوئی بھی عبادت ایک

فضول عمل ہے، نفس کی پاکیزگی کے لیے نیت اور اعمال کی پاکیزگی شرط ہے، اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ طہارت ایک کلی عمل ہے جس کی ہر شق دوسری شق سے جڑی ہوئی ہے، اس کی ابتدا بھی طہارت نفس ہے اور انتہا بھی طہارت نفس، جو سعادت یا دیدار یا رضائے الٰہی پر منتج ہوجاتی ہے۔

یہی صوفیا کا نکتۂ نظر اور فلسفہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے طہارت پر بہت مدلل بحث کی ہے اور ان کے مطابق لفظ طہارت جسم، لباس، نیت، اعمال اور نفس پر محیط ہے، طہارت کے بغیر کوئی عبادت نہ تو جائز ہے اور نہ مقبول اور اس کا استدلال انہوں نے مختلف احادیث سے کیا ہے، وہ اسے شعائر حنیفیہ میں سے کہتے ہیں اور اس کی واضح وجہ یہ ہے ہم ملت ابراہیم سے ہیں، ان کے مطابق طہارت کی اصل روح وہ لوگ پالیتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کے دلوں میں انوار ملکیہ کا ظہور ہوتا ہے، طہارت کے ذریعہ ہی نیک لوگوں اور ملائکہ کو انشراح اور سرور محسوس ہوتا ہے، اس حدیث مبارکہ کی کہ ''طہارت نصف ایمان ہے'' تشریح شاہ صاحبؒ نے یوں کی ہے'' میں کہتا ہوں کہ یہاں ایمان سے ایک ایسی ہیئت نفسانیہ مراد ہے جو نور طہارت اور خشوع سے مرکب ہے اور لفظ احسان اس معنی میں ایمان سے زیادہ واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طہارت اس کا نصف ہے''۔

پاکیزگی انسانی نفس کو مقدس کرکے اسے ملائکہ کے ساتھ ملحق کردیتی ہے، یہ بہت سے ناپاک حالات کو مٹادیتی ہے، یہ ناپاکی جسمانی بھی ہوسکتی ہے اور نفسیاتی بھی، مالی بھی ہوسکتی ہے اور روحانی بھی۔

طہارت نفس کے بغیر انسان ایمان سے متصف ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ایک غلیظ روح اور جسم اچھی چیزوں، اچھے اعمال، اچھے تعلقات اور اچھی نسبتوں کو قبول ہی نہیں کرسکتی، وہ انوار ملائکہ اور دیدار خداوندی کو نہ تو پسند کرے گی اور نہ اس کی متحمل ہوسکتی ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے ایمان کی قسموں کے ذیل میں لفظ احسان پر بحث کی ہے، ایمان کی اولین قسم یہ ہے کہ ایک شخص توحید ورسالت، معاد کی شہادت دے اور مسلمانوں کی طرح فرائض کو انجام دے، ایمان کی دوسری قسم صالح اور عمدہ اعمال کی انجام دہی پر مشتمل ہے،

اس درجہ ایمان میں اعمال صالحہ کی انجام دہی کے حساب سے کمی بیشی ہوسکتی ہے، ایمان کی پہلی قسم کے مقابلہ میں کفر اور دوسری کے مقابلے میں نفاق ہے، ایمان کی تیسری قسم کا تعلق دل سے توحید ورسالت ومعاد کی شہادت اور اعمال صالحہ کی انجام دہی ہے اس کا تعلق اطمینان اور کیفیات قلب سے ہے۔ (باقی)

حوالہ جات

(۱) راغب الطباخ: تاریخ افکار علوم اسلام، مترجم افتخار احمد بلخی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۲۵۔

(۲) قرآن حکیم: سورہ آل عمران: ۱۶۴ (۳) الانعام: ۵۷

(۴) یوسف: ۲۲ (۵) الاحزاب: ۲۱ (۶) النساء: ۱۰۵

(۷) الاعراف: ۱۵۷ (۸) آل عمران: ۳۱ (۹) ایضاً: ۳۲

(۱۰) النحل: ۴۴ (۱۱) محمد فاروق خان: حدیث کا تعارف، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۲۵

(۱۲) دہلوی شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، ص ۲۱۲-۲۰۷

(۱۳) ایضاً، ص ۲۸۸-۲۸۷ (۱۴) النجم: ۲

(۱۵) دہلوی شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ص ۲۸۸ (۱۶) ایضاً: ص ۲۷۹

(۱۷) ایضاً: ص ۲۷۸ (۱۸) الشعراء: ۱۸

(۱۹) النساء: ۶۴ (۲۰) النساء: ۸۰

(۲۱) نقوش: رسول نمبر، لاہور، جلد ۷، ص ۲۵۹ (۲۲) حجۃ اللہ البالغہ: ص ۳۷

(۲۳) ایضاً: ص ۴۰۴ (۲۴) ایضاً: ص ۳۱۱

(۲۵) ایضاً: ص ۳۰۱ (۲۶) ایضاً: ص ۳۰۳

(۲۷) تذکرۃ الاولیا: ص ۱۷۴، ۲۵۸، ۲۳۹ (۲۸) النساء: ۶۴

(۲۹) الاحزاب: ۲۱ (۳۰) الحشر: ۱۸

(۳۱) النساء: ۵۹ (۳۲) صحیح بخاری: باب ۸، حب رسول اللہ من الایمان

(۳۳) حجۃ اللہ البالغہ: ص ۸۸-۲۸۷ (۳۴) ایضاً: ص ۱۲-۳۱۱

مشاہداتِ مصر

از:- پروفیسر محسن عثمانی ندوی ☆

کتابوں کے مطالعہ کے بعد جو چیز مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے وہ روئے زمین کا سفر اور تجربات اور مشاہدات کے نگار خانوں کی سیر ہے، اتفاق بھی یہ کہ اکثر ہر بیرونی سفر کے کچھ عرصہ کے بعد دوسرے بیرونی سفر کی نوبت آجاتی ہے، ''تو ابھی رہ گذر میں ہے قید مقام سے گذر'' کی آواز آنے لگتی ہے، قل سیروا فی الأرض کا حکم بھی قرآن میں موجود ہے جو حصول عبرت کے لیے ہے، اس بار مصر کا سفر درپیش تھا جس کی تاریخ سات ہزار سال پرانی ہے، تہذیبوں کے عروج وزوال کے نقوش تخیل کے پردے پر لہرانے لگے اور تصورات کے طلسم خانے چمک اٹھے، آئینہ ایام میں ماضی حال بن کر مرتسم ہونے لگا اور شبستان خیال فروزاں ہونے لگی۔

فرعون کے زمانہ کی ایک تہذیب تھی، پانچ ہزار سال پہلے روم کے لشکر نے قاہرہ کی سرزمین پر قبضہ کیا تھا، اس وقت یہ سرزمین بابیلون کہلاتی تھی، حضرت عمر بن عاصؓ نے جب یہ شہر فتح کیا تھا تو ایک نئی آبادی بسائی تھی جس کا نام فسطاط رکھا گیا تھا، اسی کے قریب حضرت عمر بن عاصؓ کی تعمیر کی ہوئی مسجد ہے، ۹۶۹ عیسوی میں فاطمیوں نے اس ملک اور اس شہر پر قبضہ کرلیا تھا، یہ تیونس سے آئے تھے، ۹۷۳ میں فاطمیوں نے شہر کا نام قاہرہ رکھا، اس وقت قاہرہ کا شمار افریقہ یورپ اور ایشیا کے بڑے شہروں میں ہے، مشرق سے مغرب کی جانب سامان تجارت لے جانے کا سب سے بڑا مرکز یہ شہر تھا اور اس شہر کی بین الاقوامی تجارتی اہمیت اس وقت باقی رہی جب تک کہ واسکوڈی گامانے پرتگال سے انڈیا کے لیے ۱۴۹۹ میں دوسرا راستہ نہیں دریافت کرلیا، ۱۵۱۷ میں ترک عثمانیوں کے قبضہ کے بعد اس شہر کی اہمیت اور کم ہوگئی، ۱۷۹۸ میں نپولین نے

☆ صدر شعبہ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدرآباد۔

اس شہر پر قبضہ کرلیا، پھر یہاں محمد علی پاشا کی حکومت رہی، جو خاندانی حکومت کی شکل میں ملک فاروق کے عہد تک باقی رہی۔

رابطہ ادب اسلامی ایک عالمی تنظیم ہے، دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کے دفاتر قائم ہیں اور اس کے سالانہ بین الاقوامی اجتماعات اور سمینار منعقد ہوتے ہیں، مجھے ملک اور بیرون ملک اس تحریک کے پروگراموں میں شرکت کا موقع مل چکا ہے، اس بار دعوت نامہ قاہرہ سے آیا، دہلی سے پروفیسر محمد اجتبا ندوی، علی گڑھ سے ڈاکٹر سعود عالم قاسمی اور لکھنؤ سے مولانا نذرالحفیظ ندوی اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، مختلف عرب ملکوں اور ترکی اور بنگلہ دیش کے مندوبین یہاں آئے تھے، دکتور استاذ احمد عمر ہاشم چانسلر ازہر یونی ورسٹی نے ۱۸؍ اگست کو سمینار کا المرکز الکشفی ہوٹل میں افتتاح کیا، ۱۳؍ اگست ۲۰۰۵ کو میں قاہرہ کے لیے روانہ ہوا، دس دن وہاں قیام رہا، کانفرنس کے دنوں کے علاوہ سارا وقت قاہرہ اور اسکندریہ دیکھنے میں گزرا، یہاں مختلف شہروں کا ساحل بہت خوبصورت ہے، جہاں سیاح جہاز رانی کرتے ہیں اور ہلکورے کھاتی ہوئی کشتیوں سے نازک خرام پانی کی لہروں یا دیو قامت سمندر کی موجوں کا نظارہ کرتے ہیں، نرم ریت پر بیٹھتے ہیں اور سمندر کی مچھلیاں کھاتے ہیں، بحر احمر، بحر متوسط اور دریائے نیل کے ساحل پر خوبصورت مناظر پائے جاتے ہیں، مصر کے مشرق میں بحر احمر اور شمال میں بحر متوسط واقع ہے، مصر ایک ملین مربع کیلو میٹر میں پھیلا ہوا ہے، آبادی ۶۵ ملین ہے، زراعت اہم پیشہ ہے، سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے تمام مذاہب کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا جاتا ہے، عیسائی بھی بہت ہیں، یہودیوں کی بھی قابل لحاظ تعداد ہے لیکن ہندوستان کی طرح فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے ہیں، کبھی کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئی ہیں لیکن ان میں شدت پیدا نہیں ہوتی ہے، حکومت فوراً کنٹرول کرلیتی ہے۔

مصری معاشرہ مصر میں تعلیم عام ہے، ہائی اسکول تک کی تعلیم لازمی ہے اور مفت ہے، اس لیے کوئی جاہل اور غیر تعلیم یافتہ نہیں، غربت کے باوجود عربی اخبارات اور عربی کتابیں پڑھنے کا شوق بے نہایت ہے، ہندوستان کے اردو کے قارئین اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، ہر شخص اخبار پڑھتا ہے اور ہر شخص کے پاس کتابوں کی ایک چھوٹی لائبریری ضرور ہوتی ہے، مشہور مصنفین کی

کتابیں چھپتے ہی انگریزی محاورہ کے مطابق گرم کیک کی طرح بک جاتی ہیں، کتابوں کی بڑی بڑی دکانیں تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن قدم قدم پر فٹ پاتھ پر بھی بہ کثرت اخبارات اور کتابوں کی دکانیں نظر آئیں گی، یہاں جامع ازہر اور دیگر تمام یونی ورسٹی کے اساتذہ اور اہل فکر وقلم بہت پڑھتے ہیں اور بہت لکھتے ہیں، ہندوستان میں تو تعلیم وتدریس کے پیشہ سے وابستہ لوگ بھی کتابیں نہیں خریدتے ہیں اور خریداری میں کتاب ان کی آخری ترجیح ہوتی ہے، یہاں نئی نئی کتابوں کا ایک سیل سبک سیر ہے جو مصر کی سرزمین کو علمی اور فکری طور پر شاداب کرتا ہوا دوسرے عرب ملکوں کی طرف بہتا رہتا ہے، ان مصنفین میں فکر ونظر کے زاویے الگ الگ ہوسکتے ہیں، اسلام سے شدید وابستگی بھی ہوگی، مغربی تہذیب اور مغربی افکار کی پیروی کی دعوت بھی ہوگی لیکن عوام میں عمومی طور پر دین داری ہے، لوگ سفر حضر ہر جگہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بسوں میں اور مترو ٹرین میں مردوں کے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور عورتیں قرآن کی تلاوت میں مشغول نظر آئیں گی، یہاں تک کہ ایک خوانچہ فروش بھی سڑک کے کنارے اپنا سامان بیچتے ہوئے قرآن پڑھتا ہوا نظر آئے گا، ٹیکسی ڈرائیور بھی گاڑی میں قرآن پڑھتا ہوا یا قرآن کا کیسٹ سنتا ہوا نظر آئے گا، لوگ بتاتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ آتا ہے تو اس منظر میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے اور تلاوت کی بہار آجاتی ہے اور فضا قرآن کی تلاوت سے گونجتی رہتی ہے۔

عموماً مصری معاشرہ اقدار کا پابند متحفظ اسلامی معاشرہ ہے، فلمیں دکھائی جاتی ہیں، سنیما ہال میں نائٹ کلب بھی ہوتے ہیں لیکن کہیں ایک پوسٹر کوئی ایک اشتہار کوئی ایک کٹ آوٹ ایسا نظر نہیں آئے گا جس میں کوئی حیا سوز منظر ہو، اخلاق باختگی ہو، اسلامی تہذیب یہاں بھی مغربی تہذیب سے اور یوسفی زلیخائی سے ستیزہ کار ہے، اختلاط ہے جو معیوب ہے جس سے شرم وحیا کے حجابات ختم ہوجاتے ہیں اور شیطان کو دراندازی کا موقع ملتا ہے، لیکن عورتیں اور لڑکیاں سر سے پیر تک ساتر لباس میں رہتی ہیں، چہرہ نہیں چھپاتی ہیں لیکن جسم کی نمائش بھی نہیں کرتی ہیں، سر راہ اگر کسی لڑکی کے سر کے بال کھلے نظر آئیں اور زلف تا بہ کمر پڑی ہو یا وہ زلف کو لہراتی ہوئی چل رہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیرونی سیاح ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے، غالباً اسی لیے عربی شاعری میں زلفوں کے لہرانے کا اتنا تذکرہ نہیں ملتا ہے جتنا اردو شاعری میں ملتا ہے اور نہ

کوئی عربی ادب میں زلف کے میٹر سے طول شب فراق کو ناپتا ہے، اسلام مسلم معاشرہ کو پاک صاف رکھنا چاہتا ہے اور گناہ کے امکان کے راستہ کو مسدود کرنا چاہتا ہے، حجاب اسی لیے ہے لیکن وہ ساتر لباس جس میں مصری خواتین نظر آتی ہیں اور صرف چہرہ کھلا ہوتا ہے بہت سے علمائے اسلام کے نزدیک کافی ہے، ان علما میں علامہ ناصر الدین البانی کا نام نمایاں ہے، ان کے مضمون کا اردو ترجمہ وحید الدین خان کی کتاب ''خاتون اسلام'' میں موجود ہے، اخوان المسلمین کی متدین خواتین جو جماعت کی رکن ہیں، مشاورتی اور انتظامی اجتماع میں اسی مکمل ساتر لباس میں جس میں صرف چہرہ کھلا رہتا ہے شریک ہوتی ہیں اور مردوں کے سامنے اپنے علمی فکری خیالات کا اظہار کرتی ہیں، رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس میں بھی خواتین اسی طرح شریک ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنا شعری کلام بھی سنایا تھا اور وہ محرم کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہوئی تھیں، اسلام نے عورتوں کو عزت اور آزادی دی ہے، بہت حقوق دیے ہیں، وہ دینی، سماجی اور سیاسی اور معاشی کاموں میں بھی حدود میں رہتے ہوئے اور مردوں سے Mix نہ ہوتے ہوئے حصہ لے سکتی ہیں لیکن تنہا سفر اور مردوں کے ساتھ اختلاط کی اجازت کسی قیمت پر نہیں ہے، چہرہ کے شرعی پردہ کے بارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب کی ایک کتاب ہے، مولانا ابوالاعلی مودودیؒ کی بھی ایک بہت اہم کتاب پردہ ہے اور غالباً اس موضوع پر سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے لیکن خود جماعت اسلامی کے کئی مفکرین اور اراکین اس سے متفق نہیں ہیں، مولانا مودودیؒ کی علامہ ناصر الدین البانی سے اس موضوع پر گفتگو ہوچکی ہے، میری اطلاع کے مطابق البانی کی دلیلوں کے مقابلہ میں مودودی صاحب نے صرف احتیاط وتقوی کی بات کی تھی، ظاہر ہے کہ اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، دزدیدہ نگاہی اور خیانت نظر کے فتنہ کے عہد میں چہرہ کا پردہ بہتر ہے لیکن اصل بحث چہرہ کے کھولنے کے جواز اور عدم جواز کی ہے، لیکن بہر قیمت اسلام نے مرد وزن کے آزادانہ اختلاط سے سختی سے روکا ہے، حج جیسے مقدس سفر تک میں محرم کی شرط ایک علامتی شرط ہے، مقصود یہ کہ جب حج کا مقدس سفر جس میں نیت انتہائی پاکیزہ ہوتی ہے محرم کے ساتھ (یا نیک سیرت خواتین کے ساتھ) کرنا چاہیے تو عام سفر بھی خواہ دین اور دعوت کی نیت ہی سے کیوں نہ ہو حتی الامکان بلاعذر تنہا نہ کیا جائے اور مردوں کے ساتھ بغیر محرم کے اختلاط نہ ہو، خاتون اسلام کی

عصمت و عفت اور عزت و وقار کا تقاضہ بھی یہی ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے، مسلہ زن اقبال کے الفاظ میں وہیں کا وہیں اس لیے ہے کہ ہم مغربی تہذیب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اسلام کا بہ حیثیت مجموعی مزاج یہ ہے کہ عورت کا دائرہ کار گھر کے اندر ہے، اس مملکت میں اس کا درجہ مردوں سے زیادہ ہے، مردوں کا دائرہ کار گھر سے باہر ہے اور اس میدان میں ان کا درجہ عورت سے زیادہ ہے، حدیث کے مطالعہ سے اسی مزاج اسلام کا اندازہ ہوتا ہے'' ما افلح قوم ولوا أمرهم امرأة '' آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم فلاح یافتہ نہیں ہوگی جو عورت کو والی اور سردار بنائے، جہاد عورت کے دائرہ کار یعنی گھر سے باہر کی چیز ہے، اسی لیے جہاد عورت پر فرض نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورت کے لیے ایک ایسا جہاد ہے جس میں قتال نہیں اور وہ حج اور عمرہ ہے، '' علیهن جهاد لا قتال فيه الحج والعمرة '' لیکن عورت کو اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے مردوں کے ساتھ اختلاط کے بغیر علمی اور دینی ترقی کا پورا حق ہے، وہ بہت بڑی مصنفہ، عالمہ، ادیبہ، شاعرہ، اسکالر، ٹیچر اور ڈاکٹر بن سکتی ہے، وہ مفتی بن سکتی ہے، فتوے دے سکتی ہے، اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھ سکتی ہے، منع تو سیاسی اور سماجی کاموں میں حصہ لینا بھی نہیں ہے لیکن جو پابندیاں ہیں ان کا التزام اسمبلی اور پارلیمنٹ میں پہنچ کر عورت کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے یہ میدان عورت کے لیے کوئی پسندیدہ میدان نہیں ہے اور اس کے مزاج کے مطابق بھی نہیں ہے، گورباچوف جیسے کمیونسٹ اور بے عقیدہ شخص نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بچوں کی تربیت کا فقدان اور گھر کے سکون اور راحت کی بربادی آج اس وجہ سے ہے کہ عورت نے اپنی سرگرمیوں کے لیے گھر کے باہر کا میدان چن لیا ہے، لیکن جس طرح مسلم معاشرہ میں لیڈی ڈاکٹر کا ہونا بہ وجوہ ضروری ہے اور اس کے لیے ایک عورت مجبور ہے کہ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرے، اسی طرح سے مسلم خواتین کے مفاد کے لیے اور مسلم پرسنل لا کے دفاع کے لیے بعض مخصوص حالات میں خرابیوں کے علی الرغم باشعور مذہبی مسلم خاتون کا سیاست میں حصہ لینا مفید بھی ہو سکتا ہے۔

شہر میں لوگوں کا لباس عام طور پر مغربی ہے، جو لوگ قدیم لمبے عربی جبے میں جسے جلابیہ کہتے ہیں ملبوس نظر آئیں اور ان کے سر پر ٹوپی ہو وہ دیہات کے لوگ ہوتے ہیں، بعض ازہری علما

بھی جبہ و دستار میں نظر آتے ہیں اور ان کی دستار کے ساتھ سرخ رنگ کی ٹوپی ہوتی ہے، مصر کے ٹیکسی ڈرائیور اور عام افراد بھی اکثر یہ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو اجنبی شخص بیٹھا ہوا ہے یا ان سے جو ہم کلام ہے وہ مسلمان ہے یا نہیں، وہ کسی شخص کو داڑھی والا دیکھ کر یا شیروانی کرتے میں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے یا مسلمان نہیں ہے، یہاں تک کہ نام سے بھی انہیں اندازہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ عربوں میں عیسائیوں کے نام بھی مسلمانوں کی طرح ہوتے ہیں، اگر آپ نے اپنا نام عبد اللہ بتایا اور آپ کے چہرہ پر داڑھی ہے اور سر پر عمامہ ہے تب بھی وہ صراحت کے ساتھ پوچھ لیتے ہیں کہ '' انت مسلم؟'' (کیا آپ مسلمان ہیں) کبھی ان کا دریافت کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کلمہ کا وہ ایک جز لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں یا اللهم صل علی محمد پڑھتے ہیں اور آپ نے اگر اس کے جواب میں '' محمد رسول اللہ '' کہہ دیا یا '' صل علی محمد '' کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں، اب ڈرائیور یا مصری عرب خوش ہو جائے گا اور آپ سے زیادہ مانوس ہو جائے گا، اگر راستہ میں غلطی سے کسی کا ہاتھ آپ کے جسم سے لگ گیا یا آپ کو چوٹ لگ گئی تو وہ فوراً کہتا ہے '' السلام علیکم '' یعنی ہم آپ کی سلامتی چاہتے ہیں اور اس طرح فوراً معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

چائے خانے قدم قدم پر ملیں گے جہاں بغیر دودھ کی چائے ملے گی اور کہنے سے دودھ کی بھی چائے پیش کر دی جائے گی، چائے کی کوالیٹی عام طور پر بہت اچھی ہوتی ہے اور تھکان دور ہو جاتی ہے اور اقبال کا یہ مصرعہ زبان پر آنے لگتا ہے '' علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی '' بہت سے چائے خانوں میں حقے کا رواج ہے جسے شیشہ کہتے ہیں، لوگ چائے کے بعد حقے سے دل بہلاتے اور غریبی کا غم غلط کرتے ہیں، نالۂ دل کی طرح وہ شیشۂ محفل بھی پریشان ہو کر بکھر جاتا ہے، دیر دیر تک ان قہوہ خانوں اور چائے خانوں میں بیٹھنے کا رواج بہت ہے، خان خلیلی کے بازار میں وہ قہوہ خانہ موجود ہے جہاں نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ بیٹھا کرتا تھا۔

جو لوگ گریجویشن کر لیتے ہیں، حکومت ان کو ان کی طلب پر ملازمت فراہم کرتی ہے، اس کے باوجود بے روزگاری کی شرح گیارہ فی صد ہے، افراط زر کی شرح دس فی صد ہے، امریکہ سالانہ تقریباً ڈیڑھ بلین ڈالر کی مدد کرتا ہے جس سے معیشت سنبھل جاتی ہے، حکومت

طلب کرنے پر ہر گریجویٹ کو ملازمت دیتی ہے، اس لیے بسا اوقات ایک کام کے لیے چار چار آدمی آفس میں نظر آجاتے ہیں، یہ اس لیے کہ کام کم ہے اور آدمی زیادہ ہیں، تنخواہ ضرور کم ہوگی لیکن ملازمت مل جاتی ہے، دو سو پونڈ سے تین سو پونڈ تک عام طور پر تنخواہ ہوتی ہے، جس سے گھر کا خرچ نہیں چل سکتا ہے، ایک پونڈ آج کل چھ روپے سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے، ضروریات کی تکمیل کے لیے لوگ پارٹ ٹائم بھی کام کرتے ہیں اور گھر کا ہر فرد کام کرتا ہے، خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ دفتروں میں کام کرتی نظر آتی ہیں، کسی کام کو وہاں کے معاشرہ میں عیب نہیں سمجھا جاتا ہے، پیشہ کو عیب کی بات سمجھنا ہندوستان کی خصوصیت ہے، ہر گریجویٹ کو یہاں کی حکومت ملازمت دیتی ہے، اس لیے یہاں کوئی شخص بے کار نہیں رہتا، آمدنی میں اضافہ کے لیے فاضل اوقات میں لوگ دوسرے کام کرتے ہیں، اسکول یا کالج کا ایک ٹیچر اپنی آمدنی میں اضافہ کے لیے ٹیکسی چلا سکتا ہے اور بغیر کسی شرم کے وہ دوسروں کے سامنے اس کا اظہار بھی کر سکتا ہے، معاشی بدحالی کا نہنگ ہر شخص کے سامنے منہ کھولے کھڑا رہتا ہے، فاقہ مستی نہیں ہے لیکن عیش و مستی بھی نہیں ہے، سرکاری طور پر ہزاروں بیکریوں کا سبسیڈی کے ساتھ انتظام ہے جہاں بہت ہی سستے داموں پر صبح، دوپہر، شام تندوری روٹیاں تیار ہوتی ہیں، سڑکوں اور دکانوں پر فروخت ہوتی ہیں، پانچ پیسے (قرش) میں روٹی مل جاتی ہے، دو روٹیاں اور فول یا طعمیہ شکم سیر ہو کر کھانے کے لیے کافی ہے جس کے جیب میں پچیس پیسے ہوں وہ بھوکا نہیں رہ سکتا ہے۔

برصغیر کو مستثنیٰ کر کے دنیا میں ہر جگہ شادی کا مالی بوجھ لڑکے کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دنیا کے جغرافیہ میں ہندوستان وہ بے غیرت ملک ہے جس میں لڑکی والوں کو زیر بار کیا جاتا ہے، جنہیں گھوڑے جوڑے کی رقم یا ہندوؤں کی طرح تلک کی رقم دینی پڑتی ہے، شادی کے اور جہیز کے اخراجات الگ برداشت کرنے پڑتے ہیں اور مہر بھی معجّل کے بجائے مؤجل ہوتا ہے یعنی جب دینے کا موقعہ ہوتا ہے تو لڑکے والے اسے وعدہ فردا پر ٹال دیتے ہیں اور جب لینے کا موقع ہوتا ہے تو لڑکی والوں سے نقد وصول کرتے ہیں، مصر میں شادی کے وقت لڑکے کو لڑکی کے لیے الگ فلیٹ کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور جایداد کا نصف حصہ لڑکی کے نام لکھنا پڑتا ہے، اور مہر کی ادائگی بھی ضروری ہے اور مہر کم از کم دس ہزار پونڈ تو ضرور ہوتا ہے، لڑکی بھی چونکہ برسر روزگار ہوتی ہے اس

لیے وہ اپنے فلیٹ کو نئے فرنیچر سے آراستہ کرنے میں حصہ لیتی ہے، جہاں یہ بات مردانہ غیرت کے مطابق ہے کہ وہ شادی کے اخراجات کا ذمہ دار ہو اور مہر ادا کرے، وہاں اقتصادی حالت کی خرابی کی وجہ سے لڑکے کے لیے شادی کے لیے بڑی رقم کا متحمل ہونا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ بڑی رقم کے جمع کرنے میں عمر عزیز کا ایک حصہ گزر جاتا ہے اور شادیاں تاخیر سے ہوتی ہیں، ہندوستان میں سامانِ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی کی شادی میں دشواری ہوتی ہے، عرب ملکوں میں ضروری سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے لڑکے کی شادی میں دشواری ہوتی ہے، اس عدم اعتدال اور عدم توازن اور اختلاط Free mixing نے بعض دوسری خرابیوں کو جنم دیا ہے، جدید تعلیم گاہوں میں لڑکے اور لڑکیاں گناہ سے بچنے کے لیے نکاح عرفی کر لیتے ہیں جس کے فارم یا نکاح نامے اسٹیشنری کی دکانوں تک میں مل جاتے ہیں، اس کے بعد ایک قاضی اور دو گواہ کی ضرورت رہ جاتی ہے، یہ کمی دوست احباب پوری کر دیتے ہیں، اس نکاح میں اکثر والدین تک کو خبر نہیں ہوتی ہے اور زوجین کے درمیان کوئی جھگڑا ہو تو عدالتیں اس نکاح کو جسے نکاح عرفی کہتے ہیں تسلیم نہیں کرتی ہیں، عربی اخبارات کے اندازہ کے مطابق مصر میں کم از کم ساٹھ لاکھ نکاح عرفی کے کیس ہو چکے ہیں، مصر میں شوافع کی تعداد حنفیوں سے کچھ زیادہ ہے، لیکن حکومت کے اکثر قوانین حنفی فقہ کے مطابق ہیں اور حنفی فقہ میں ولی کے بغیر بھی گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

شہر پر ایک طائرانہ نظر قاہرہ کا مشہور بازار خان الخلیلی ہے، پارچہ بافی اور قالین اور چمڑے کی صنعت کے لیے ملک میں مشہور ہے، عطریات کے لیے بھی اس شہر کی شہرت ہے، خوشبودار مصالحے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، سوق الوکالۃ میں سوتی کپڑوں کا مارکٹ ہے، حرانیہ اور کرداسہ میں بنے ہوئے قالین ملتے ہیں، ہوٹلوں میں قیام کرنے والوں کے لیے سیاحت کی سہولتیں حاصل ہیں، ٹراول ایجنسی کے ذریعہ ہر جگہ کی سیاحت کا انتظام ممکن ہے، سفر میں گائیڈ بھی رہتے ہیں، قاہرہ میں مصر کی آبادی کا ۲۶ فی صد موجود ہے، قاہرہ ٹاور ۱۸۷ میٹر اونچا ہے، قاہرہ کے درمیان سے دریائے نیل بہتا ہے جو ملک کی سرسبزی اور شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے، شام کے وقت کشتی رانی اور جہاز میں سیر کا منظر جنت نگاہ ہے، دریا کے مغرب میں جیزہ کا مشہور اہرام واقع ہے، یہاں کا میوزیم بھی دیدنی ہے اور تاریخی عجائبات کا مجموعہ ہے، کو پنگ میوزیم

خاص طور پر بے حد اہم ہے جو قدیم قاہرہ میں ہے، فرعون کے زمانہ اور اسلامی عہد کے درمیانی عہد کا نام عیسائی عہد ہے، اس عہد کی بہت سی چیزیں اس میوزم میں موجود ہیں اس کے علاوہ قاہرہ کا میوزم بھی دیکھنے کے لائق ہے جو تحریر اسکوائر قلب شہر میں واقع ہے، ایک اسلامک آرٹ میوزم بھی ہے، اسی طرح ایک مصری تہذیب کا میوزم ہے، آٹھویں صدی کا چرچ قاہرہ میں موجود ہے، اسے چرچ آف ورجین کہتے ہیں، یہاں پانچویں صدی عیسوی کا بھی چرچ ہے اسے سینٹ آف باربرا کہتے ہیں۔

پبلک گارڈن اور زولوجیکل گارڈن دیکھنے کے لیے سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے، فرعونی گاؤں (ویلیج) ہے جہاں روشنی اور آواز کے ذریعہ فرعون کے عہد کی تہذیب پیش کی جاتی ہے، اسی طرح کلچرل سنٹر بھی قابل دید ہے۔

قاہرہ شہر کی مٹرو ٹرین بہت خوبصورت ہے، اسے فرانس نے تیار کیا ہے، معاہدہ کے تحت پچاس سال تک اس کی آمدنی بھی حکومت فرانس کو ملے گی اس کے بعد اس پر مصر کا قبضہ ہو جائے گا، دریائے نیل سے زمین کی زرخیزی بلا کی ہے، قاہرہ سے اسکندریہ تک لہلہاتے ہوئے کھیت خوش نمائی اور دیدہ چشم کی بینائی میں اضافہ کر رہے تھے، زمین کا کوئی حصہ بنجر اور بے کاشت نظر نہیں آیا، مصر کی روئی دنیا بھر میں مشہور ہے اور نیل کے کنارے کنارے کھیتوں میں کپاس کے پھولوں کی نقرئی چمک دامان نظر کو کھینچتی ہے، انگریزی زبان کا کوٹن کا لفظ اصلاً عربی زبان کا لفظ قطن ہے، جس طرح سے عربی کا لفظ فردوس انگریزی میں پیراڈائیز بن گیا اسی طرح سے قطن کوٹن بن گیا، پھلوں اور میووں کی پیداوار بہت ہے، آم بہت ہوتے ہیں، امرود اور سنترے، انگور اور انجیر کے باغات بہ کثرت ہیں، چاول، گیہوں، باجرا اور گنے کی کاشت ہوتی ہے، البتہ صحرائے سینا کا علاقہ ریگستانی علاقہ ہے، مصر سے فلسطین جاتے ہوئے علامہ اقبال کا گزر اس صحرا سے ہوا تھا اور انہوں نے وہ مشہور نظم کہی تھی جس کا سرنامہ ''ذوق وشوق'' ہے اور جس کا یہ شعر ہے

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

پہلے ایک جنگ میں صحرائے سینا پر اسرائیل کا قبضہ ہو چکا تھا پھر کچھ شرطوں کے ساتھ اس

کا تخلیہ عمل میں آیا اور مصر نے اپنے آپ کو مسئلہ فلسطین سے الگ کر لیا، بحر احمر کے ساحل پر شرم الشیخ ذہب اور مرسی مطروح وغیرہ مقامات پر یہودی اور عیسائی اور بیرونی سیاح خوب داد عیش دیتے ہیں، عسکریت پسندوں نے شرم الشیخ کی ایک تفریح گاہ کو غالباً اسی لیے اپنی کاروائی کے لیے منتخب کیا تھا، وہاں اس وقت تیس ہزار اطالوی اور دس ہزار برطانوی سیاح موجود تھے، چونکہ مصر اسرائیل کے ساتھ تعلقات رکھتا ہے اور دینی جماعتوں پر امتناع عائد ہے اور وہ اخوانی جو نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں جیلوں میں بند ہیں، اس لیے عسکریت پسند مختلف مقامات کو نشانہ بناتے رہتے ہیں، زراعت کے بعد سب سے بڑی آمدنی ملک کو سیاحت سے حاصل ہوتی ہے، دنیا بھر کے سیاح سات ہزار سالہ تہذیب کو جس کے آثار قدم قدم پر موجود ہیں دیکھنے آتے ہیں، وہ جگہ جہاں فرعون کا محل تھا اور محل کے سامنے دریائے نیل میں حضرت موسیٰ کو بہتے ہوئے فرعون کی بیوی نے نکالا تھا اور پرورش کی تھی اسوان میں موجود ہے، صحرائے سینا میں وہ جبل طور موجود ہے جہاں حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے أرنی کہہ کر دیکھنے کی فرمائش کی تھی، جواب یہ ملا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے، پھر اللہ کی تجلی کا ظہور ہوا تھا اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو گئے تھے اور چٹانیں چور ہو گئی تھیں، یہ بہت بلند پہاڑ ہے جس کی چوٹی تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اور قاہرہ سے ساڑھے چار سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، شرم الشیخ کے دھماکہ کے بعد اس علاقہ میں تفتیش ان دنوں سخت ہے اور ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ وہاں جانا مناسب نہیں ہے، فیوم کے راستے میں ایک مقام پر سجن یوسف لکھا ہوا ملے گا، قیاس ہے کہ عزیز مصر کا گھر یہیں تھا، زلیخا یہیں رہتی تھی اور یہیں حضرت یوسفؑ کو جیل میں بند کیا گیا تھا، دریائے نیل کے کنارے وہ جگہ موجود ہے جہاں ایام جاہلیت میں ہر سال ایک نوجوان دوشیزہ کو موبوں کے بھینٹ چڑھایا جاتا تھا تاکہ لوگ آفات سے محفوظ رہیں اور وہ جگہ بھی ہے جہاں حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کا خط دریائے نیل کے نام پانی میں ڈالا تھا، مصر میں سیکڑوں عبادت گاہیں تھیں جن کے حجری اصنام کو میوزم میں محفوظ کر دیا گیا ہے، شہر میں ایک نہیں کئی میوزم ہیں جو سیاحوں کو متوجہ کرتے ہیں۔

ہندوستانی سفارت خانے میں

میں ۱۳ راگست کی شام کو قاہرہ پہنچ گیا تھا، جامع ازہر اور کلیہ دار العلوم اور جامعہ قاہرہ میں ہندوستان کے بہت سے طلبہ پڑھتے ہیں، محمد مبین سلیم ندوی،

محمد شفیق انور، محمد شہاب الدین، محمد عمران الفراہی، سعود عالم، محمد نور اللہ، محمد عبداللہ صفی اور حافظ شعیب اسلم خورشید، اشرف اقبال ندوی، یہ اور دوسرے طلبہ ملاقات کے لیے آئے، یہی احباب اور پاکستان کے امجد عزیز، ایک پردیسی اور مسافر کے لیے سفر میں مونس و ہمدرد، رہنما اور رفیق سفر تھے، بہت سے ہندوستانی طلبہ نے فرمایش کی کہ میں ۱۵/ اگست کی صبح کو ہندوستانی سفارت خانے چلوں اور یوم آزادی کی تقریبات میں حصہ لوں، میں نے خوشی کا اظہار کیا، سعود عالم اور نور اللہ صبح کو مجھے لینے کے لیے ہوٹل آگئے، ہندوستانی سفارت خانے میں تیس چالیس کی تعداد میں ہندوستانی باشندے موجود تھے، طلبہ کے علاوہ بوہرے مسلمان بھی موجود تھے جو قاہرہ میں کافی تعداد میں ہیں، جھنڈا لہرانے کی رسم کے بعد خورد ونوش کی محفل رہی، قاہرہ میں ابوالکلام آزاد سنٹر بھی ہے جس سے عربی رسالہ صوت الشرق نکلتا ہے، اس رسالہ کے ذمہ دار بھی موجود تھے، محمد وفا حجازی اس کے اڈیٹر ہیں، عملاً اس کی ذمہ داری منی عبدالکریم کے ہاتھ میں ہے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور میڈیا کے لوگ بھی تھے، ٹیلی ویژن کے عملہ نے میرا انٹرویو لیا اور قاہرہ کے بارے میں میرے تاثرات کے بارے میں سوال کیا، فرسٹ سکریٹری سے ملاقات ہوئی، سفیر ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔

دریائے نیل کی سیر

مصر اور قاہرہ کا کوئی تذکرہ دریائے نیل کے بغیر مکمل نہ ہوگا، یہ دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے، اس کا پانی چار ہزار میل کا سفر طے کرتا ہے اور جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے، جب کہ دنیا کے دوسرے دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں، پانی شفاف ہے، لندن کے دریائے ٹیمز کی طرح یہ دریا شہر کے وسط سے زلف مشکیں کی طرح لہراتا، بل کھاتا، سنگ رہ سے گاہ بگاہ ٹکراتا ہوا گزرتا ہے، اس کے دونوں طرف شہر آباد ہے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت پل ہیں جو شہر کے دونوں طرف کے حصے کو ملاتے ہیں، ان پلوں کے نیچے سے چھوٹے جہاز گزرتے ہیں اور جس وقت سورج طشت افق سے لے کر لالے کے پھول بکھراتا ہے تفریح کے لیے لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر نیلگوں آسمان کے نیچے نیل کے حسین دریا میں رنگین شام میں گزارتے ہیں اور قلب ونظر کے لیے سرور ومسرت کا سامان کرتے ہیں، ہم نے سرشام بھی اس دریا کی سیر کی، بہ وقت شب بھی ان روشنیوں سے لطف اندوز ہوئے جن کا عکس پانی پر پڑ رہا تھا اور دن کے کامل تین گھنٹے بھی دریا میں جہاز پر القناطر الخیریہ تک آنے جانے میں گزارے،

القناطر الخیریہ ایک جزیرہ اور تفریح گاہ ہے جو شہر قاہرہ سے پچاس کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور جہاں کانفرنس کے تمام مندوبین کو لے جایا گیا تھا اور درختوں کے سایے میں عربی زبان کا ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں مختلف عرب ملکوں سے آئے ہوئے شعرا اور شاعرات نے حصہ لیا تھا، درختوں کے رومانی سایے میں شعر کی محفل دلوں کو لبھا رہی تھی، دریائے نیل کی مچھلیوں کے کباب سے ہم لوگوں کی تواضع کی گئی تھی، عشرت ساحل بھی اور عشرت منزل بھی حاصل تھی، شہر سے باہر نکلنے کے بعد دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے، نیل کے ساحل پر لوگ طرح طرح کے مشروب اور بھنے اور ذائقہ دار چیزیں بیچتے رہتے ہیں، ہزاروں سال سے دریائے نیل بہ رہا ہے، اس کی موجوں نے نہ جانے کتنی تہذیبوں کی آبیاری بھی کی ہے اور تہذیب کے نہ جانے کتنے سفینے اس میں غرق بھی ہو چکے ہیں، یہ بوڑھا دریا آج بھی جواں ہے، جاوداں ہے اور پیہم رواں ہے، دریائے نیل کی خوبصورتی نے دیدہ ودل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور احساس کی کشتی نازک لہروں کے ساتھ جھوم رہی تھی۔

شعروادب کے خیاباں میں

مصر عالم عرب کا علمی، فکری اور ادبی دار السلطنت قلعۂ معلٰی اور حصن حصین ہے، یہاں کے ادیب اور شاعر معزز اور ہر دل عزیز ہوتے ہیں اور ان کے اقلیم قلم کی حکمرانی ملک سے باہر دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، علما اور اسلامی مفکرین میں جن کی کتابیں بہت پڑھی جاتی ہیں علی الجمعہ (مفتی الدیار المصریہ) احمد عمر ہاشم سابق رئیس (چانسلر) جامع ازہر، دکتور عبداللہ برکات نائب مدیر کلیۃ الدعوۃ، دکتور عبداللہ السمک استاذ کلیۃ الدعوۃ، دکتور محمد حسن عثمان استاذ کلیۃ الدراسات الاسلامیہ، دکتور احمد الطیب چانسلر جامع ازہر، دکتور سید محمد طنطاوی شیخ الازہر، دکتور عبدالحلیم عویس، محمد الغزالی، شیخ متولی شعراوی، عبدالحمید کشک، محمد قطب وغیرہ بہت سے مقبول عام مصنفین ہیں، غیر مصری علما میں یوسف القرضاوی اور سعید رمضان البوطی کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، برصغیر کے علما اور مفکرین میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابوالاعلی مودودی عوام وخواص دونوں میں مقبول ہیں، مصر میں اہل ادب اور نثر نگار بڑی تعداد میں ہیں، محمد التہامی، کمال نشأت، عبدالمنعم یونس، نبیل راغب، جابر قمیحہ عبدالعزیز، محمودہ جابر عصفور زغلول نجار، جلال امین، فہمی ہویدی محمد عمارہ، مستشار طارق البشری، محمد سالم العوا، عبدالعظیم المطعنی، انیس منصور، مصطفی محمود، محمد حسین ہیکل، احمد رجب کا شمار معروف مصنفین اور اہل قلم میں ہوتا ہے،

ناول نگار اور افسانہ نویس اہل قلم میں سب سے مشہور نام نجیب محفوظ کا ہے جو اب اسکندریہ میں رہتے ہیں، فکشن میں مشہور ادیب یوسف ادریس، احسان عبدالقدوس اور توفیق الحکیم اور نجیب کیلانی ہیں، ان چاروں کا انتقال ہو چکا ہے، بہ قید حیات لوگوں میں ابراہیم سعفان، محمد جبرئیل یوسف القعید کے نام ہیں، بہ حیثیت نقاد جن لوگوں کی شہرت ہے ان میں انور الجندی (حال میں انتقال ہوگیا) شوقی ضیف (ابھی انتقال ہوا)، عزالدین اسماعیل عبداللطیف، طاہر مکی، محمد عبد المطلب، عبدہ زاید، محمد عبدالحمید خلیفہ اہم نام ہیں، خواتین میں بھی ادب وتصنیف کا ذوق ہے، نجات احمد فواد اور حنا فیناز کاظمہ کے نام معروف ہیں، مزاح نگاروں کی بھی ایک تعداد ہے، مصر میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی عام ہے، اردو ادب کے مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کی طرح عربی ادب میں جن کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے اور جن کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، وہ شیخ عبدالعزیز البشری ہیں، مزاحیہ ادب کو الادب الساخر کہتے ہیں، اس مزاحیہ نگاری کے میدان کے دوسرے مشہور ناموں میں محمد مستجاب اور محمد شفیق مصری ہیں، جدید شعرا کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا ہے، مشہور بہ قید حیات شعرا میں محی الدین خلیل، وحید الدین ہشام، محمد فائد عثمان، امین صادق، محمد عبدہ ابوقمر، محمود شحاتہ، عبدالرازق سالم الغول، اسماعیل نجیب، محمد محمود حسین، ابراہیم صبری، احمد عبدالحفیظ، احمد بسیونی، محمود خلیفہ غانم، طاہر العشانی، مجوب موسیٰ احسن عثمان، محمود امین، مجوب موسیٰ، احمد شہلول، احمد مبارک، صلاح الدین اللقانی، اسماعیل عقاب فاروق جودہ اور محمد ثابت معروف شاعر ہیں، نزار قبانی جن کا انتقال ہوگیا مقبول شاعر رہے ہیں لیکن وہ آزادی اور اباحیت کے علم بردار رہے ہیں، بہت سے ادیب اور شاعر ہیں جو اپنے فن کے ذریعہ تہذیب اور مذہب کی عمارت میں نقب زنی اور رہزنی کا کام کرتے ہیں، شاعرات میں نوال فہمی، خیریہ صابر، نور نافع، نجات شادر ربیع، سامیہ عبدالسلام، ایمان بکری، حیاۃ ابونصر، محبوبہ ہارون، فاطمہ السید، ناہید اسماعیل، ہبہ عصام الدین شریفہ، السید ثریا العسیلی کے نام ہیں، مصر کے باہر بھی بہت سی شاعرات ہیں جیسے اردن کی نبیلہ الخطیب، سعودی عرب کی خدیجہ صبان، مراکش کی فاطمہ جادالحق، شام کی خدیجہ مکحلی، عمان کی سعیدہ فارسی، کویت کی سعاد الصباح، یمن کی جمیلہ الرجوی، الجزائر کی حبیبہ محمدی، سعودی عرب کی اشفاق

بخاری مشہور ہیں، ادبی رسالوں میں الادب والنقد کے نام سے رسالہ نکلتا ہے بعض مشہور اہل قلم اخبارات میں اپنے کالم کے ذریعہ علم وادب کی آبیاری کرتے ہیں، اخبارات کے بعض صفحات بعض دنوں میں ادبی اور تہذیبی مضامین کے لیے خاص ہوتے ہیں، علم وہنر ادب وشعر کی کہکشاں ہے جن سے فکر ونظر کا آسمان روشن ہے، ان ستاروں میں بہت سے اسلام دوست ہیں، بہت سے ترقی پسند ہیں، بہت سے فرنگی تاب ہیں اور بہت سے اخلاق واقدار کے پابند ہیں۔

مجمع اللغۃ العربیۃ

مصر میں زبان وادب کی انجمنیں بے شمار ہیں لیکن ان تمام انجمنوں میں سب سے موقر سب سے قدیم انجمن جس نے سب سے زیادہ علمی، ادبی کتابیں شائع کی ہیں اور ملک کے مشہور اہل قلم جس سے وابستہ رہے ہیں مجمع اللغۃ العربیۃ ہے، پندرہ اگست ۲۰۰۵ کو جب ہندوستانی سفارت خانہ میں جھنڈا لہرانے کی رسم اور خورد و نوش سے فارغ ہوئے تو مجمع اللغۃ العربیۃ پہنچے، یہ بھی زمالک میں ہے اور سفارت خانہ سے تھوڑے فاصلہ پر ہے، شوقی ضیف کا مارچ ۲۰۰۵ میں انتقال ہوا، وہ اس اکیڈمی کے صدر تھے، سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، انتقال سے پہلے بیماری کی حالت میں بھی کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹی، سب سے زیادہ خوش قسمت وہی انسان ہے جس کا جانماز اور کتاب سے رشتہ کبھی اور کسی حال میں نہیں ٹوٹتا ہے اور ان دونوں سے جس دن کسی کا رشتہ ٹوٹا وہ اس کی عمر رائگاں کا ایک دن ہے، جس کو یہ دو نعمتیں مل جائیں وہ سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ مالدار ہے، علم اور عبادت کی نعمتوں سے یکسر خالی بڑے بڑے اصحاب منصب اور ارباب بست وکشاد کم حیثیت اور دو کوڑی کی طرح بے قیمت معلوم ہوتے ہیں، سب سے زیادہ بیش قیمت اور خوش قسمت وہ انسان ہے علم جس کی عبادت ہو اور عبادت علم الیقین سے متصف ہو، ۱۸۹۲ میں اس انجمن کا قیام عمل میں آیا، اس وقت شیخ محمد عبدہ اور شیخ محمد شنقیطی اس کے اراکین میں شامل تھے، حفنی ناصف اور شیخ خضری جیسے زبان وادب کے ماہرین بھی بعد میں اس سے وابستہ رہے تھے، احمد لطفی سید کا بھی اس سے تعلق رہا ہے، ۱۹۳۲ میں اس ادارہ نے سرکاری حیثیت اختیار کرلی اور بیرون ملک کے علما کو اس کی اعزازی ممبری دی جانے لگی، کتابیں شائع ہونے لگیں، معاجم اور لغات کی طرف توجہ کی گئی، مختلف علوم کے لیے علاحدہ علاحدہ کمیٹیاں ہیں جو ان علوم پر کتابوں کی اشاعت کی نگرانی کرتی ہیں، وقتاً فوقتاً علمی اور ادبی موضوعات پر سمینار بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں، ادارہ کے

کئی ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی، عربی زبان میں بے تکلف اظہار خیال کی مشق نے ہر جگہ حجاب بے گانگی کو ختم کردیا اور ہر جگہ میرے ساتھ تکریم اور محبت کا سلوک کیا گیا۔

مکتبہ کامل کیلانی میں قاہرہ مکتبوں کا شہر ہے، کتابیں چھپتی ہیں اور لوگ خرید کر پڑھتے ہیں، مشہور مصنفین کی کتابوں کے اڈیشن پر اڈیشن نکلتے ہیں شہر کے کئی مکتبوں میں میرا جانا ہوا لیکن شارع سلطان سے گزرتے ہوئے ایک جگہ مکتبہ کامل کیلانی کا بورڈ دیکھ کر قدم رک گئے، کامل کیلانی بچوں کے ادیب تھے اور ہم نے بچپن میں عربی زبان سیکھنے کے زمانے میں کامل کیلانی کی کئی کتابیں پڑھی تھیں، اردو میں جس طرح اسماعیل میرٹھی کا نام اور کام، اردو زبان میں بچوں کے لٹریچر میں معتبر سمجھا جاتا ہے، اسی طرح عربی میں کامل کیلانی اور حکایات کامل کیلانی کی شہرت ہے، کامل کیلانی نے بہت سے لوگوں کو عربی زبان کا ادیب اور انشا پرداز بنایا ہے، کامل کیلانی کا بہت پہلے انتقال ہوچکا تھا، میں خوشی کے جذبات کے ساتھ مکتبہ میں داخل ہوا، بچوں کا عربی لٹریچر سلیقہ سے رکھا ہوا تھا، میں نے مکتبہ کے منیجر کے سامنے کامل کیلانی کے لٹریچر سے اپنی مناسبت اور تعلق کا اظہار کیا تو اس نے مکتبہ کے مالک کامل کیلانی کے صاحب زادے رشاد کامل کیلانی کو فون کردیا، انہوں نے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور بتایا کہ وہ آرہے ہیں لیکن چونکہ دس کیلومیٹر کے فاصلہ پر جیزہ کے مقام پر رہتے ہیں اس لیے دیر ہوگی، پھر انہوں نے فون پر منیجر کو کچھ کہا اور پھر تھوڑی دیر میں انواع واقسام کے کھانے اور مختلف قسم کے مشروبات سامنے رکھ دیے گئے، عرب مہمان نوازی کا منظر سامنے آگیا، مغرب کا وقت قریب تھا، آدھے گھنٹے میں رشاد کامل کیلانی صاحب مع اپنی بیگم کے مکتبہ میں تشریف لائے، میاں بیوی دونوں روزے سے تھے، دوشنبہ تھا عرب ملکوں میں دوشنبہ اور جمعرات کو دینی مزاج رکھنے والے اکثر روزے رکھتے ہیں، ہمارے ملک میں رمضان کے علاوہ بہت کم ہی روزے رکھے جاتے ہیں، کچھ لوگ پندرہ شعبان اور دس محرم کے روزے رکھ لیتے ہیں لیکن عرب ملکوں میں نفل روزے رکھنے کا اہتمام ہندوستان سے زیادہ ہے، مغرب کی نماز کے بعد ایک گھنٹے تک ہندوستان کی شخصیتوں کے بارے میں پوچھتے رہے، وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی سے بہت متاثر تھے اور مصر کے ریڈیو سے ان کی ایک قدیم تقریر آ سمعی یا مصر چھاپتے رہتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں، رخصت ہوتے وقت انہوں نے بہت سی کتابوں کے تحفے دیے۔

(باقی)

ابن عبدربہ اور اس کی کتاب

العقدالفرید

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH U.P.

از:- ڈاکٹر محمد قمرالدین قاسمی ☆

اندلس عہد وسطیٰ میں علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا ایک بڑا مرکز اور علما، ادبا، شعرا، فلاسفہ، حکما اور اطبا کا گہوارہ تھا، اندلس کے درخشندہ ستاروں میں ابن عبدربہ کا نام بہت ممتاز تھا، وہ قرطبہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، اس دور میں علم فقہ کی جانب لوگوں کا زیادہ رجحان تھا، اس لیے ابن عبدربہ نے بھی شروع میں فقہ کی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ دی اور دیگر علوم بھی حاصل کیے، اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ فن کی علمی وادبی مجالس میں شریک ہوکر اپنے علمی ذوق وشوق کو پروان چڑھایا اور اپنی زبردست قوت حافظہ کے باعث جلد ہی قرطبہ کی علمی مجالس ان سے پررونق ہونے لگیں اور انہیں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، عربی شعروادب پر ان کی گہری نظر نے ان کی شہرت وعظمت میں چار چاند لگادیے۔

ابن عبدربہ فی البدیہہ شعر کہتا تھا اور جب بھی طبع آزمائی کا ارادہ کرتا تو شعر اس کی زبان سے بے ساختہ رواں ہونے لگتے تھے، عوام کی طرح خواص سے بھی اس کی شاعری نے داد تحسین حاصل کی (۱)، وہ اکثر فرحت وانبساط کی تلاش میں رہتا اور موسیقی کے سروں میں گم ہوجاتا، ایک دفعہ وہ قرطبہ میں کسی امیر کے محل کے پاس سے گزر رہا تھا، وہاں پر گانے کی محفل آراستہ تھی، جب گانے کی آواز اس کے کان میں پڑی تو ٹھہر گیا اور صاحب قصر کو یہ اشعار لکھ بھیجے:

یا من یضن بصوت الطائر الغرد   ما کنت أحسب هذا البخل فی احد

لو أن سماع اهل الارض قاطبة   اصغت الی الصوت لم ینتقص ولم یزد (۲)

☆ شعبہ عربی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

صاحب قصر کو جیسے ہی اس کا رقعہ ملا تو وہ شعر پڑھنے کے بعد فوراً نیچے اترا اور ابن عبدربہ کو اپنی مجلس میں لے گیا اور اس سے مزید اشعار سن کر محظوظ ہوا۔

وہ شروع میں عورتوں کی محفلوں میں بھی نشست و برخواست رکھتا تھا لیکن زندگی کے آخری ایام میں تائب ہو کر کہتا ہے:

زمان كان فيه الرشد غيا   وكان الغيّ فيه من رشادي (۳)

ابونواس (۱۴۵-۱۹۹ھ) کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خلیفہ امین کے قتل کے بعد شراب اور لہو ولعب سے تائب ہو کر پاکیزہ زندگی گزارنے لگا تھا۔

ابن عبدربہ کی زندگی میں ایک طرف تو خوش حالی اور آسودگی دکھائی دیتی ہے اور دوسری جانب حوادث و آلام کی تلخیوں سے بھی وہ دوچار رہا، سب سے پہلے ۳۱۴ھ میں اسے اپنے بڑے بیٹے یحیی ابن عبدربہ کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا (۴)، ابھی اس جاں گسل حادثہ سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ دوسرا لخت جگر شیر خوارگی کے ایام ہی میں داغ مفارقت دے گیا اور ابھی مکمل طور پر یہ صدمہ زائل بھی نہیں ہوا تھا کہ خود بیمار پڑ گیا اور اپنی موت سے کچھ سال (غالباً ۶ر سال تک) مفلوج ہو کر صاحب فراش رہا (۵)، اس زمانے میں اس نے جو اشعار و قطعات کہے وہ ایک ہی وزن اور قافیہ میں منظوم کیے گئے ہیں، ان اشعار میں زہد و ترک دنیا اور توبہ و انابت کا مضمون بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

يا قادرا ليس يعفو حين يقتدر   ماذا الذي بعد شيب الرأس تنتظر
عاين بقلبك ان العين غافلة   عن الحقيقة واعلم انها سقر (۶)

ابن عبدربہ کے کلام کا ایک بڑا حصہ عبرت و نصیحت سے پر ہے، جس میں اس نے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کا نقشہ پر اثر انداز میں کھینچا ہے، ایک جگہ کہتا ہے:

ألا انما الدنيا غضارة أيكة   اذا اخضرّ منها جانب جفّ جانب
هي الدار ما الآمال الا فجائع   عليها ولا اللذات الا مصائب (۷)

ابن عبدربہ مفلوج ہونے کے بعد بھی اپنی شہرت و عظمت کی بنا پر مرجع خلائق بنا ہوا تھا، مختلف شہروں سے علما، ادبا اور شعرا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ بستر علالت پر بھی انہیں

مستفیض کرتا اور شائقین علم و ادب کو اپنی کتاب 'العقد الفرید' کی روایت کی اجازت دیتا تھا، بالآخر قرطبہ ہی میں ۸۱ر سال ۸ر ماہ ۸ر دن کی عمر میں جمادی الاولی ۳۲۸ھ کو شعر و ادب کا یہ چراغ گل ہو گیا (۸)، اس کے سانحۂ ارتحال سے پورا شہر غم و اندوہ میں ڈوب گیا اور چہار جانب صف ماتم بچھ گئی، بڑی تعداد میں لوگ جنازے میں شریک ہوئے اور مقبرۂ بنی عباس میں اسے سپرد خاک کردیا گیا، ابن عبدربہ خود تو خاک کی آغوش میں چلا گیا لیکن اس کی عدیم النظیر تصنیف العقد الفرید آج بھی جاری ہے۔

ابن عبدربہ کو شاعری کے تمام اصناف مثلاً ہجو، مدح، مرثیہ، غزل گوئی، زہد اور وصف نگاری کے علاوہ فن موسیقی اور طب وغیرہ میں بھی دست رس حاصل تھی (۹)، اس کے خیالات ندرت و انفرادیت کے حامل ہیں اور اس کی شاعری عربی زبان و ادب پر اس کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے، اس کے خیالات و موضوعات میں بڑی دل کشی اور تنوع ہے اور اس کی شاعری بہترین تشبیہوں اور نادر استعاروں سے مرصع ہے (۱۰)۔

ابن عبدربہ نے قصاید و قطعات کے علاوہ فن موشحات میں بھی طبع آزمائی کی ہے، موشح دراصل اس قصیدہ یا نظم کو کہتے ہیں جو گانے کے لیے کہی جائے، اس کا یہ نام وشاح سے مشابہت کی بنا پر رکھا گیا ہے، جو موتیوں اور یاقوت سے مزین ایک دوہری پٹی ہوتی ہے یا موتیوں سے مرصع ایک چرمی پٹی ہوتی ہے جسے عورتیں اس طرح پہنتی ہیں کہ وہ ایک کاندھے سے لے کر دوسری طرف کے کولہے تک پہنچ جاتی ہے (۱۱)۔

موشح کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک میں تو پورے بیت ہوتے ہیں اور دوسرے میں صرف مصرعے، یہ صنف شاعری شعر کی ان ''سات قسموں'' (فنون) میں سے ہے جنہیں متاخرین کی اختراع سمجھا جاتا ہے، جس میں خالص نحوی اصول و قواعد کی پابندی کی جاتی ہے (۱۲)۔

موشح کے چند بند ہوتے ہیں جن کا اصطلاحی نام صحیح طور پر معین نہیں ہوا، عام طور پر انہیں جزیا بیت کہا جاتا ہے، اپنی مکمل ترین صورت میں موشح کی ابتدا ایک یا دو ابیات سے ہوتی ہے جو اصل نظم کی تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں، اس تمہید کو ''مذہب''، ''غصن'' یا ''مطلع'' کہتے ہیں، بعض اوقات موشح میں ''تصریع'' بھی پائی جاتی ہے (۱۳)۔

فن موشحات کے سلسلے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس فن کا موجد ابن عبدربہ تھا لیکن اس کی موشح نگاری کے مشکل انداز کو نباہنا اور اس کے طرز پر شاعری کرنا لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا، اس کی وجہ سے اس کے موشح کو حسن قبول حاصل نہیں ہوسکا اور نہ ہی فن موشح میں خود اس کا نام روشن ہوا (۱۴)۔

بعض دوسرے ناقدین کے خیال میں موشح کا موجد عبادہ بن ماء السماء تھا، اس سے پہلے اندلس میں اس فن کا کوئی وجود نہیں تھا، اس لیے لوگ موشحات کے فن سے نہ واقف تھے اور نہ ہی اس طرز وانداز کی شاعری کرتے تھے، لیکن عبادہ بن ماء السماء نے جب لوگوں کو اس فن سے روشناس کرایا اور ادبا وعلما اور شعرا کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا تو وہ بھی اس طرز پر شاعری کرنے لگے (۱۵)۔

مدحیہ قصاید میں بھی ابن عبدربہ نے شہرت پائی، اس نے نہ صرف خلفا اور امرا کی مدح کی بلکہ علما اور ادبا کو بھی اپنی مدح سرائی کا موضوع بنایا، اس کے مدحیہ قصاید میں ممدوح کی عادات حسنہ اور خصائل حمیدہ، شجاعت وبہادری اور سخاوت وفیاضی اور ان کے علم وفضل کا ذکر ہے، اس نے ممدوح کی جود وسخا کو بارش اور سمندر سے تشبیہ دی ہے (۱۶)۔

اس کی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے متنبی کی طرح اسے غزل گوئی میں کمال حاصل تھا، متنبی اسے "ملیح الاندلس" کے نام سے پکارتا تھا، اس کی غزل سادہ اور تکلف وتصنع سے پاک تھی، اس کے دوسرے معاصرین شعرا اور ادبا نے بھی غزل گوئی میں اس کے درجے کو تسلیم کیا ہے، اس کی غزلیں اس کے شباب کے دور کی یادگار اور عشق ومحبت کے جذبات کی ترجمان ہیں مگر بڑھاپے میں اسے اپنی بے راہ روی کا احساس ہوا تو وہ تائب ہوگیا اور زہدیہ اشعار کہنے لگا جس کی مقدار غزلیہ اشعار سے کم نہیں ہے، اپنے اس شعری مجموعہ کو اس نے "الممحصات" کے نام سے موسوم کیا (۱۷)۔

جبرائیل جبور ستانی کا خیال ہے ابن عبدربہ نے زہد میں ابوالعتاہیہ کی پیروی کی ہے، جس طرح ابوالعتاہیہ عالم شباب میں لہو ولعب اور عشق ومستی کی طرف مائل تھا مگر آخر عمر کی شاعری میں زہد اور دنیا کی مذمت میں اشعار کہنے لگا، بعینہ اسی طرح ابن عبدربہ نے بھی آخر عمر میں نادم

ہو کر زہد کو اپنا شعار بنالیا اور دنیا کی مذمت میں اشعار کہنے لگا (۱۸)۔

مرثیہ گوئی میں بھی ابن عبدربہ کا درجہ بلند تھا، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب العقد الفرید کا ایک حصہ اس کے لیے مخصوص کیا ہے، اس کے وہ مراثی جو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی وفات پر کہے تھے بڑے ہی موثر اور دردانگیز ہیں (۱۹)۔

ہجویہ اشعار بھی بہ کثرت کہے ہیں جن میں چند قصاید بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ایک تو اپنے ہی دوست اور شاعر یحیی القلفاط کی ہجو کے جواب میں کہا تھا، اس کے علاوہ ابوعبید منجم، ابو حفص عمر بن تلہیل کاتب اور اپنے بھتیجے کے ہجو میں بھی بہ کثرت اشعار کہے ہیں۔

ابن عبدربہ پہلا اندلسی شاعر ہے جس نے اصول شاعری کے مطابق شاعری کی اور فن عروض کی مشکل بحور کو بہ آسانی یاد کرنے کے لیے منظوم شکل میں پیش کیا۔

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ متنبی جیسا شاعر بھی ابن عبدربہ کے کمال شاعری کا معترف تھا، اسے جب اندلس کا کوئی ادیب وشاعر مل جاتا تو اس سے ابن عبدربہ کے اشعار ضرور سنتا۔

ابن عبدربہ عبدالرحمان الناصر کے دربار سے زیادہ وابستہ رہا، وہ ان کی مدح میں رطب اللسان رہتا تھا، الناصر کے مغازی کو اپنے ایک ارجوزہ میں نظم کیا ہے جو العقد الفرید میں جابجا مذکور ہے، ابن عبدربہ پر جب بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوئے تو وہ دنیا کی تمام لذتوں کو ہیچ سمجھنے لگا اور جب یقین ہوگیا کہ اب موت قریب ہے تو کہتا ہے:

اتلهو بين باطية وزير　　وانت من الهلاك على شفير

فيا من غرّه امل طويل　　يؤديه الى اجل قصير (۲۰)

ابن عبدربہ ایک فطری شاعر تھا، اس کے اشعار زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ترجمان اور فکر ونظر کو جلا بخشنے والے ہیں، اس نے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا تھا اور اپنے فکر وفن میں اسی کے جلوے دکھائے ہیں، اس کا تعلق براہ راست بادشاہوں سے رہا، اس لیے اس کی شاعری سلاطین کے واقعات اور انسانی معاملات کا مرقع ہے۔

العقد الفرید

العقد الفرید ابن عبدربہ کا سب سے اہم علمی کارنامہ ہے، اس کی یہ کتاب متنوع ادبی وعلمی معلومات پر مشتمل ہے، اس میں جابجا موقع کی مناسبت سے اپنے اور دوسرے

شعرا کے اشعار نقل کیے ہیں، العقد الفرید کی سب سے اہم خصوصیت اس کی جامعیت اور انداز بیان کی دل آویزی ہے، اس میں جو مختلف ادبی موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان کو پیش کرنے کا انداز بڑا دل کش ہے، اسی طرح قرآن وحدیث، فقہ، علم تاریخ اور دوسرے موضوعات ومسائل پر بھی مصنف نے اظہار خیال کیا ہے، پوری کتاب میں اپنے خطبات دیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی فکر بہت منظم ومرتب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنا کر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے، کتاب افراط وتفریط اور حشو وزواید سے پاک ہے، اس کے موضوعات سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے تہذیبی اور ادبی ذخایر کو اس نے اچھی طرح کھنگھالا ہے، اسی بنا پر اس کی کتاب میں علوم وفنون کا ایک پورا شہر آباد ہے۔

العقد الفرید عربی علم وادب کی بنیادی اور امہات کتب میں شمار ہوتی ہے جو آج تک اہل علم ودانش کا مرجع ومصدر بنی ہوئی ہے، جس میں منتشر ومختلف مسائل، متفرق واقعات و حوادث، انساب وامثال، اشعار حتیٰ کہ طب اور موسیقی کے متعلق بھی معلومات یکجا کردی گئی ہیں، اس کے علاوہ علم العروض، علم الالحان اور علم التواریخ، جاہلی دور کے واقعات، انساب اور پڑوسیوں کے مختلف النوع واقعات کے متعلق بھی معلومات ہیں (۲۱)، اس کتاب نے ابن عبدربہ کو شہرت وعظمت کے بام عروج پر پہنچادیا جس سے چاردانگ عالم میں اس کی قابلیت، وسعت علم ونظر، زور انشا اور فصاحت وبلاغت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔

ابن عبدربہ نے کتاب کے ہر باب کو "ہیرے" کا نام دیا ہے اور اسے پچیس حصوں یعنی پچیس ہیروں میں منقسم کیا ہے، وہ اس کی ترتیب وتبویب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میں نے "العقد الفرید" کی تالیف میں بہترین ادبی جواہر منتخب کیے ہیں جو مسجع ومقفی عبارت میں ہیں اور ہر باب کے آغاز کی تمہید میں علما، حکما اور ادبا کے اقوال پیش کیے ہیں" (۲۲)۔

آخر میں وہ رقم طراز ہے کہ میں نے عربی ادب کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تو مجھے وہ ادب کے اکثر موضوعات اور ادبی روایات سے خالی نظر آئیں، اس لیے میں نے العقد الفرید کو ہر لحاظ سے جامع، کافی اور مکمل بنانے کی کوشش کی ہے، اس میں ادبی روایات بھی نقل کی ہیں،

بادشاہوں کے کلام کو بھی درج کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر باب کو اپنے اور دوسروں کے اشعار سے بھی مزین کیا ہے (۲۳)۔

ابن عبدربہ نے العقد الفرید کی جلدوں میں جاہلی دور سے لے کر عہد عباسی تک کے دو سو شعرا کے کم وبیش دس ہزار اشعار نقل کیے ہیں، طوالت کے خوف سے تمام شعرا کے نام درج کرنا ممکن نہیں تاہم ہر دور کے نمایندہ اور ممتاز شعرا کی ایک فہرست دی جاتی ہے:

نابغہ ذبیانی، امرؤ القیس، طرفہ، الاعشی، حسان بن ثابت، لبید بن ربیعہ، زہیر بن ابی سلمی، عنترہ اور عدی وغیرہ، ان تمام لوگوں کا شمار جاہلی دور کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے، جریر، اخطل، فرزدق، ابن ابی ربیعہ، جمیل، کثیر، ذوالرمہ وغیرہ، ان کا شمار عصر اموی کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے، بشار بن برد، ابونواس، بحتری، ابوتمام، ابوالعتاہیہ وغیرہ کا تعلق عہد عباسی سے ہے جن کو ابن عبدربہ نے اپنی کتاب میں جگہ دی اور ان کے اشعار سے استدلال کیا ہے (۲۴)۔

ابن عبدربہ کی انفرادیت نے جہاں اپنی کتاب میں متعدد علوم وفنون کا ذکر کیا ہے، وہاں مختلف ادوار کے قصے کہانیوں کو بھی موضوع بحث بنایا لیکن مصنف کا بنیادی مقصد علمی اور ادبی امور ومباحث ہیں، چنانچہ اس نے مختلف علوم وفنون سے تعرض کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ ادبی حیثیت سے اسے ادبی شہ پارہ بنانے کا خواہش مند تھا اور بہ طور تائید ابن قتیبہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جو شخص عالم بننے کا خواہش مند ہو اس کو ایک فن میں مہارت حاصل کرنی چاہیے لیکن جو شخص ادیب بننا چاہتا ہے، اسے علوم وفنون میں قدرت حاصل کرنی چاہیے" (۲۵)۔

اس کتاب کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں احادیث کو مختلف مسائل میں بہ طور استدلال نقل کیا ہے، بے شمار ائمہ متقدمین کے افکار وخیالات اور بعض مقامات پر قرآنی آیات کی تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں۔

العقد الفرید کو متقدمین ادبا کی کتابوں میں اولین مرتبہ حاصل ہے، عربوں کی سیاسی اجتماعی اور ادبی تاریخ کے بارے میں اسے مصدر کی حیثیت حاصل ہے، ابن عبدربہ نے اپنی کتاب میں خلفاے راشدین، صحابہ کرام، اموی خلفا، عربوں کے ابتدائی حالات اور اموی حکم رانوں کے درمیان اختلافات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جن کا مطالعہ تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے

ضروری ہے، العقد الفرید میں سیاسیات، اجتماعیات، اقتصادیات اور ادبیات کا جایزہ تاریخی اعتبار سے لیا گیا ہے، اس نے ''کتاب الوفود'' (۲۶) میں عبد اللہ بن جعفر کے وفود کی خبر جس طریقہ سے تاریخی انداز سے بیان کی ہے اور پھر ان کے اقتصادی اور اجتماعی حالات پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے، یہ نہج اور انداز عام مورخین کے یہاں نہیں ملتا۔

ان خوبیوں کے باوجود العقد الفرید کا ایک خاص نقص یہ ہے کہ اس میں بعض اخبار و واقعات بغیر تحقیق بھی نقل کیے گئے ہیں جو اس کے تاریخی ضعف کو واضح کرتی ہیں (۲۷)۔

العقد الفرید میں منقول بعض واقعات کی بنا پر ابن عبدربہ کو ناقدین کے اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا مثلاً اس کے دوست یحییٰ القلفاط نے اس پر تنقید کرتے ہوئے العقد الفرید کو مذاق اور دل لگی کا مجموعہ اور ''حبل الثوم'' (لہسن کی گٹھری) کے لقب سے موسوم کیا اور مشہور ادیب و شاعر صاحب ابن عباد نے بھی اس کتاب پر تنقید کی ہے (۲۸)۔

العقد الفرید کی جانب مستشرقین کا اعتنا

مستشرقین ادبا نے العقد الفرید کی اہمیت کی بنا پر اس کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا ہے مثلاً توزنل نے العقد الفرید میں قدیم اقوام کی تاریخ سے متعلقہ مواد کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا اور اس کا عنوان ''ماقبل اسلام عربوں کی تاریخ سے متعلق رسائل'' رکھا، یہ رسالہ ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۸ء میں شایع ہوا (۲۹)۔

العقد الفرید میں موسیقی اور اصوات سے متعلقہ مواد کو (Music: The Price Less Jewel) یعنی ''موسیقی بیش قیمت جوہر'' کے عنوان سے انگریزی زبان میں منتقل کیا، فرانسیسی مصنف لوی ہرو دانسال نے العقد الفرید سے چند ادبی و شعری مواد کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا، نیکل نے العقد الفرید کے کچھ شعری مواد کو انگریزی زبان میں منتقل کیا، اسے کنتشہ نے انگریزی سے ہسپانوی زبان میں بھی منتقل کیا اور کوول نے غزلیہ شاعری اور ارجوزہ کے ساتھ ابن عبدربہ کے سوانح کو بھی انگریزی زبان میں شایع کیا (۳۰)۔

العقد الفرید کی دو تلخیص بھی کی گئیں لیکن یہ دونوں ضایع ہوگئیں، سب سے پہلے ابواسحاق ابراہیم بن عبدالرحمان نے العقد الفرید کا اختصار کیا تھا، اس کے بعد ابن منظور صاحب ''لسان العرب'' نے بھی اس کا اختصار کیا تھا، اس کے علاوہ تیسرا اختصار ''مختار العقد الفرید'' کے نام سے شایع ہوا،

یہ اختصار اس قدر عمدہ اور جامع ہے کہ وہ اصل کتاب سے قاری کو بے نیاز کر دیتا ہے۔

غرض العقد الفرید ایک ایسی جامع و منفرد کتاب ہے جس میں عربوں کی صدیوں کی ذہنی کاوشوں کو جمع کر دیا گیا ہے، مصنف نے اس میں کسی ایک موضوع ہی کو نہیں اپنایا ہے بلکہ عربوں کی تاریخ و تہذیب کا جوہر کھینچ لیا ہے، یہ قرآن و حدیث، شعر و ادب اور تاریخ کے میدان میں اس کی فکری عظمت کا ثبوت ہے اور اس حسین بوقلموں مرقع سے اس کی بصیرت، علمی تبحر اور ادبی دیدہ وری کا پتا چلتا ہے، اس نے بڑے موثر انداز میں اسے گوناگوں معلومات و مواد کا ایک قیمتی خزانہ بنا دیا ہے، پوری کتاب میں اس کی دانش وری کی عظمت جلوہ فگن ہے جو علم و ادب کے شیدائیوں کے لیے ہمیشہ سرمۂ بصیرت کا کام دے گی۔

حواشی

(۱) حمیدی: جذوۃ المقتبس، ۱/۱۴۵، احمد بن الضبی: بغیۃ الملتمس، ص ۵۲۸۔ (۲) یاقوت الحموی: معجم الادبا، ۴/۲۱۶۔ (۳) الثعالبی: یتیمۃ الدہر، ۱/۴۱۶۔ (۴) ابن الفرضی: تاریخ علماء الاندلس، ۱/۴۰۔ ۱۸۷۔ (۵) جبرائیل جبور: ابن عبدربہ و عقدہ، ص ۲۷۔ (۶) یاقوت الحموی: معجم الادبا، ۴/۲۴-۲۲۳۔ (۷) ابن عبدربہ: العقد الفرید، ۳/۱۷۵۔ (۸) دائرۃ المعارف (عربی)، ۳/۳۳۷۔ (۹) دائرہ معارف اسلامیہ، ۱/۵۹۵۔ (۱۰) جبرائیل جبور: ابن عبدربہ و عقدہ، ص ۱۴۶۔ (۱۱) دائرہ معارف اسلامیہ: ۲۱/۸۱۳۔ (۱۲) ایضاً: ۲۱/۸۱۴۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) احمد امین: ظہر الاسلام: ۳/۱۹۱۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) جبرائیل جبور: ابن عبدربہ و عقدہ، ص ۱۳۰۔ (۱۷) مصطفیٰ الشکعہ: مناہج التالیف، ص ۲۹۹۔ (۱۸) جبرائیل جبور: ابن عبدربہ و عقدہ، ص ۱۳۵۔ (۱۹) ابن عبدربہ: العقد الفرید، ۳/۳۲۸-۳۱۸۔ (۲۰) ایضاً: ۳/۱۸۹۔ (۲۱) یاقوت الحموی: معجم الادبا، ۴/۲۱۵۔ (۲۲) ابن عبدربہ: العقد الفرید، ۱/۲۔ (۲۳) ایضاً: ۱/۴۔ (۲۴) جبرائیل جبور: ابن عبدربہ و عقدہ، ص ۹۰۔ (۲۵) ابن قتیبہ: عیون الاخبار۔ (۲۶) ابن عبدربہ: العقد الفرید، ۲/۳۔ (۲۷) احمد امین: ظہر الاسلام، ۶/۸۶۔ (۲۸) دائرہ معارف بزرگ اسلامی (فارسی): ۴/۱۹۱۔ (۲۹) ایضاً: ۴/۱۹۲۔ (۳۰) ایضاً۔

٭٭٭٭٭٭٭٭٭

شیخ نورالدین احمد طاووسی شیرازی

(مزید معلومات)

از:- ڈاکٹر عارف نوشاہی ☆

معارف، اعظم گڈھ، شمارہ مارچ ۲۰۰۵ء میں پروفیسر محبوب حسین احمد حسین عباسی صاحب کا مضمون ''شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ اور ان کا رسالہ اخلاق سلطانی'' (صفحات ۱۸۴-۱۹۴) مطالعہ سے گزرا، پروفیسر عباسی صاحب نے ایک گمنام مصنف کی بالکل نایاب تصانیف پیش کر کے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے جس پر وہ شکریے کے مستحق ہیں، میرے لیے یہ مضمون بہ طور خاص مفید ثابت ہوا، لہذا ان سطور کے ذریعے غایبانہ طور پر فاضل مضمون نگار سے خصوصی اظہار ممنونیت کرتا ہوں۔

حال ہی میں راقم السطور نے ایک کتاب مرتب اور شایع کی ہے جس میں شیخ نورالدین احمد طاووسی کا نام بار بار آیا ہے، جب میں اس کتاب پر تعلیقات لکھ رہا تھا تو ہمارے پاس شیخ طاووسی کے بارے میں معلومات کا قطعاً فقدان تھا، لیکن اب پروفیسر عباسی صاحب کا مضمون شایع ہونے کے بعد شیخ طاووسی سے متعلق ہماری اطلاعات کا دایرہ قدرے وسیع تر ہو گیا ہے۔

میری مرتبہ کتاب حال ہی میں تہران سے شایع ہوئی ہے اور ابھی پاکستان و ہند کے کتب خانوں میں کم یاب ہے، اس لیے اس کا تعارف اور اس سے شیخ طاووسی کے بارے میں متعلقہ سطور قارئین کے لیے پیش کرتا ہوں۔

مجھے ۱۹۹۴ء میں استنبول کے ایک سفر میں کتب خانہ سلیمانیہ کے ذخیرہ چلبی عبداللہ (نمبر ۳۰۲) میں ایک فارسی قلمی کتاب معدن الدُّرر فی سیرة الشیخ حاجی عمر دیکھنے اور اس کی مائیکرو فلم حاصل کرنے کا موقع ملا، یہ شمس الدین محمد بن سلیمان عمری مرشدی نے ۸۶۹ھ میں شیراز میں تصنیف کی،

☆ صدر شعبہ فارسی، گورڈن کالج، راول پنڈی۔

یہ ایران کے علاقہ لُرستان کے ایک بالکل گمنام شیخ طریقت حاجی ناصرالدین عمر کے حالات و کرامات و ملفوظات پر مشتمل ہے، حاجی عمر لُرستان کے گاؤں شست میں ۷۱۳ یا ۷۲۳ھ میں پیدا ہوئے، نوجوانی میں کازرون چلے گئے اور وہاں ابواسحاق کازرونی شیخ مرشد (۳۵۲-۴۲۶ھ) کے مزار پر چلہ کشی کی اور سلسلہ مرشدیہ میں خطیب رکن الدین عبدالعزیز بن خطیب عبدالرقیب سے خرقہ طریقت حاصل کیا، حاجی عمر سفر حج پر بھی گئے، واپسی پر تیس سال کازرون میں ریاضت کشی کرتے رہے اور اواخر عمر میں شیراز کے محلہ دروازۂ موردستان میں اپنی خانقاہ مسجد اور مدرسہ کی عمارت بنوائی، ۸۲۶ھ میں وفات پا کر اسی خانقاہ میں دفن ہوئے لیکن آج اس خانقاہ کے آثار صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں، کتاب الدرر کے مصنف صاحب تذکرہ حاجی عمر کے دوسرے بھائی بدرالدین سلیمان کے بیٹے اور مرید تھے اور اس کتاب میں انہوں نے اپنے چچا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چشم دید ہے یا حاجی عمر کے براہ راست مریدوں اور خلفا سے سن کر لکھا ہے، کتاب اس کے مصنف اور صاحب تذکرہ حاجی عمر کے بارے میں فارسی ادب کے تمام ماخذ خاموش ہیں اور ان تینوں کے بارے میں سوائے اس کتاب کے کہیں اور سے کچھ راہ نمائی نہیں ملتی، کتاب کی اسی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر راقم السطور نے اسے ڈاکٹر معین نظامی، صدر شعبہ فارسی پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کی معاونت سے مرتب کیا اور نشر کارزونیہ، تہران نے مارچ ۲۰۰۵ء میں شایع کیا۔

معدن الدرر میں حاجی عمر کے ایک خلیفہ نورالدین احمد بن ابوالفتوح طاووسی کا ذکر طویل القاب کے ساتھ ملتا ہے اور ان سے ان کے شیخ طریقت حاجی عمر کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں، یہاں بعض اقتباسات دیے جاتے ہیں:

۱- در مجلسی دیگر کہ ذکر مہمات و ملتمسات مفصل ارباب مملکت از علما و صلحا و غیرھم فی فرمودند و در آن مجلس مولانا نورالدین احمد ابوالفتوح کہ از خلفاے حضرت منورہ بود، حاضر بود۔ (ص ۵۴)

۲- نقل است از مولاناے اعظم، زبدة المحدثین حاجی نورالدین احمد ابوالفتوح مدّ اللہ عمرہ کہ فرمود ...... ۔ (ص ۷۲)

۳- مولاناے اعظم قدوة المحدثین نورالملة والدین احمد بن ابوالفتوح طاووسی مدّ اللہ

عمرہ کہ از خلفائے حضرت مقدسہ است فرمود...... ۔(ص ۸۴)

۴- بعد از چندروز مولانا نورالدین احمد ابوالفتوح طاوسی کہ از خلفائے حضرت مقدسہ بود گفت...... ۔(ص ۹۸)

۵- معدن الدرر کے مصنف نے مولانا نورالدین احمد کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے شیراز میں عمرشیخ مرزا کی پوتی مریم سلطان دختر امیرزادہ پیر محمد سے کچھ رقم قرض لے رکھی تھی اور اسے واپس کرنے کی مزید مہلت مانگ رہے تھے، اس سلسلے میں مصنف کے بھائی امام الدین محمد سے جو حاجی عمر کی خانقاہ کے متولی تھے، سفارش ڈلوائی لیکن کامیابی نہ ہوئی، یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے مصنف نے مولانا طاوسی کی اس روز کی وضع قطع اور حالت بیان کی ہے جو دل چسپی سے خالی نہیں، ''مولانائے اعظم نورالدین احمد ابوالفتوح روزمی پیادہ وآشفتہ و پریشان بہ بُقعہ آمد بہ خلاف عادت پیراہن یک تہ پوشیدہ وتخفیفہ برسرنہادہ واستغاثہ نمود وگفت کہ مراقرضی بہ مریم سلطان دختر امیرزادہ پیر محمد می بایدداد وعُسر حالی دارم وچندنوبت مہلت طلبیدہ ام وخلاف وعدہ شدہ اکنون مغل شاہ نام فرستادہ وتمام عورات وفرزندان رابہ اضطراب آوردہ وانواع اہانت و بے ادبی می نماید...... ۔(ص ۱۲۵-۱۲۶)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں:

۱- رکن الدین احمد ''مولانائے اعظم'' اور ''قدوۃ المحدثین'' تھے، ۲- معدن الدرر کی تصنیف کے وقت (۸۶۹ھ) زندہ تھے، ۳- حاجی ناصرالدین عمر کے خلیفہ تھے، ۴- اپنے اہل و عیال سمیت شیراز میں تنگ دستی کی زندگی گزارر ہے تھے۔

پروفیسر عباسی صاحب نے شیخ طاوسی کے رسایل کے حوالے سے ان کے بارے میں جو باتیں ہم تک پہنچائی ہیں، یہ ہیں:

۱- شیخ طاوسی ۸۳۱ھ میں شیراز میں بہ قید حیات تھے جیسا کہ ان کے مجموعہ رسایل کے ترقیمے سے ثابت ہے، علم حدیث کے ماہر تھے، ۲- شیخ طاوسی کی نسبت ''احمدی'' اور ''مرشدی'' ہے، ۳- وہ شاہ رخ تیموری (جلوس ۸۰۷ھ، وفات ۸۵۰ھ) کے معاصر اور مداح تھے اور رسالۂ اخلاق سلطانی اسی کے لیے لکھا تھا۔

پروفیسر عباسی کی مہیا کردہ اور معدن الدرر سے منقول معلومات میں جو مشترک نکات دونوں شخصیات کو فرد واحد سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، یہ ہیں:

۱- ان کا نام احمد اور لقب نورالدین ہے، والد کا نام ابی الفتوح ہے، ۲- نسبت طاوسی اور مرشدی ہے، ۳- علم حدیث کے ماہر ہیں، ۴- شاہ رخ کے عہد میں زندہ تھے، یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ شاہ رخ اور حاجی ناصرالدین عمر کے مابین تین ملاقاتیں ہوئی تھیں اور معدن الدرر کے مصنف نے ان کا احوال بہ تفصیل لکھا ہے جس سے حاجی عمر کی شاہ رخ کے حال پر مہربانی اور شاہ رخ کی حاجی عمر سے عقیدت مترشح ہوتی ہے، بعید نہیں کہ شیخ طاوسی کا شاہ رخ سے تعلق بھی اپنے شیخ طریقت حاجی عمر کے تعلق کی وجہ سے ہو۔

پروفیسر عباسی صاحب نے حکیم علامہ عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر کے حوالے سے نورالدین احمد طوسی کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، بالخصوص شیخ طاوسی کے سفر گجرات کی شہادت صرف نزہۃ الخواطر کے حوالے سے ملتی ہے جب کہ معدن الدرر کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۸۶۹ھ میں شیراز میں زندگی بسر کررہے تھے، صاحب نزہۃ الخواطر نے انہیں طاوس الحرمین شیخ ابی الخیر کا مرید بتایا ہے، (غالباً اسی وجہ سے نسبت ''طاوسی'' تھی) لیکن معدن الدرر میں انہیں کئی مقامات پر حاجی عمر کا خلیفہ لکھا ہے، ایک اور ماخذ میں شیخ طاوسی کو شیخ روز بہان بقلی شیرازی (۵۲۶-۶۰۶ھ) کے سلسلہ کا مرید لکھا ہے[1]، خود شیخ روز بہان سلسلہ مرشدیہ میں سراج الدین خلیفہ کے مرید تھے، البتہ اس میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے کیونکہ ایک آدمی کئی سلاسل طریقت سے وابستہ اور مجاز ہوتا ہے اور شیخ طاوسی نے بھی کئی سلاسل یا شیوخ سے اجازت لے رکھی ہوگی۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمیں شاہ رخ کے زمانے کے ایک شیرازی مصنف کے تین نایاب فارسی رسائل درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانے میں دست یاب ہیں اور ان کے مندرجات سے اس مصنف کے کچھ حالات بھی مستنبط ہوتے ہیں۔

---

[1] شیخ شطاح روز بہان فسائی تصنیف غلام علی آریا، تہران، ۱۹۸۴ء، ص ۳۸۔

اخبار علمیہ

چند مہینوں سے ''الفرقان الحق'' کتاب اخباروں کی سرخیوں میں چھائی رہی ہے، اس کے یہودی مصنف ڈاکٹر انیس شروش مقیم امریکہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی کتاب قرآن مجید کا متبادل ہے، مصنف عالم گیر شہرت کے حامل، آکسفورڈ سوسایٹی آف اسکالر کے رکن، عربی، انگریزی اور عبرانی زبانوں سے واقف ہیں، اس سے قبل ان کی ایک کتاب ''اسلام بے نقاب'' ۱۹۸۸ء میں نکلی جس کے اب تک آٹھ اڈیشن نکل چکے ہیں، دوسری کتاب ''اسلام - ایک خطرہ یا چیلنج'' ۲۰۰۳ء میں شایع ہوئی تھی۔

الفرقان الحق امریکی عیسائیوں کی تنظیم ''ایوانجیلی'' کے منصوبے اومیگا کے تحت شایع کی گئی ہے، جس کا مقصد پورے عالم بالخصوص مسلم ملکوں کے سادہ لوح مسلمانوں کو دام نصرانیت میں پھنسانا اور ان کو اپنا ہم عقیدہ و ہم خیال بنانا ہے، اس کے لاکھوں کی تعداد میں نسخے عربی اور انگریزی زبانوں میں امریکی واین پریس سے چھپ چکے ہیں، ۳۶۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل ۷۷ سورتیں ہیں جن کے نام قرآنی سورتوں کے طرز پر ''الفاتحہ، الانجیل اور الجان'' وغیرہ رکھے گئے ہیں اور قرآن کے بسم اللہ کی طرح اس کی بھی ہر سورہ کا آغاز ایسے فقرے سے کیا گیا ہے جس سے عقیدۂ تثلیث کا اثبات ہوتا ہے، کتاب میں تعدد ازدواج کو حرام، طلاق کو ناجایز اور صفات الٰہی کا انکار کیا گیا ہے، کویت کے پرائیویٹ انگریزی اسکولوں کے طلبہ و طالبات کو یہ کتاب مفت دی گئی ہے، عرب امارات، عراق اور مصر میں اسے عام کرنے کی کوشش بھی ہو رہی ہے، پاکستان میں اس پر پابندی نہیں ہے صرف ہندوستانی حکومت نے اپنے ملک میں اس کی خرید و فروخت پر قدغن لگا دی ہے۔

جامعہ ازہر کے مفتی اعظم شیخ علی جمعہ نے موبائل فون پر بل کی جگہ قرآنی آیات کا استعمال ناجایز اور محل نظر قرار دیا ہے کیونکہ موبائل ایسی جگہوں پر بھی لے جایا جاتا ہے جہاں قرآنی آیات

کی تلاوت یا اس کا سماع ممنوع ہے، یہ امر قرآنی عظمت و حرمت کے بھی منافی ہے۔

اٹلی کی فلورنس یونی ورسٹی کے کالج برائے سائنسی علوم کے نصاب میں اسلامی شریعت کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے، جس کے تحت لیگ آف اسلامک یونی ورسٹیز کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر جعفر عبدالسلام کا بیان ہے کہ شرعی احکام کے مختلف پہلوؤں بالخصوص مسئلہ اجتہاد پر توجہ دی جائے گی تاکہ جدید زمانے کے تقاضوں کو اسلامی شریعت سے ہم آہنگ کیا جائے، مصر اور دیگر اسلامی ملکوں کے ماہرین قانون و شریعت کالج کے اسٹاف کے لیے منتخب کیے جارہے ہیں۔

رسالہ ''نیچر'' کی خبر ہے کہ سائنس دانوں نے سپر کمپیوٹر کے ذریعہ موجودہ حقیقی کائنات کی مصنوعی شکل تیار کی ہے تاکہ یہ پتا لگائیں کہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں یہ کائنات کیسے وجود میں آئی، اس تجربہ کا نام ''ملینیم رن'' رکھا گیا ہے جو اس سمت میں اب تک کی سب سے بڑی کوشش ہے، سائنس دانوں کے خیال میں کائنات کا وجود ''بگ بینگ'' کے ذریعہ ہوا جس کے فوراً بعد ٹھنڈے اور گہرے مادے نے کائنات کا سب سے بڑا مادہ پیدا کیا جو اپنے ہی وزن سے ٹوٹ گیا اور بڑے بڑے مقناطیسی دایروں نے کہکشاؤں کی تخلیق میں اہم رول ادا کیا، سائنس دانوں نے اپنے کمپیوٹر میں مشاہدہ کیا کہ یہ کائنات کس طرح ایک پُر اسرار مادہ سے وجود میں آئی، اس طرح مصنوعی کائنات بنا کر اصل کائنات کے رازہائے تخلیق سے واقف ہونے کی کوشش کی جارہی ہے۔

"When Science Spoke Arabic" نام سے ریاض میں ایک نمایش منعقد کی گئی، ریاض فلانتھروفک سوسایٹی فار سائنسز جو التراث کے تحت ہے اور فرانس ایمبیسی نے مل کر اسے منعقد کیا تھا جس میں سائنس کی تاریخ نشو و نما اور اس کی ترقیات کو نمایاں کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا، زائرین کی دل چسپی سائنس کے مختلف میدانوں میں عربوں اور مسلمانوں کے کارناموں سے رہی، التراث آرگنایزیشن کے ڈایرکٹر نے بتایا کہ اس نمایش نے ان مسلمانوں کے کارناموں کو یاد کرنے کا خوبصورت موقع فراہم کیا جنھوں نے Mathmatic (ریاضی) Measurment (پیمایش) Exprement (تجربہ) Medical Treatment (طبی معالجات) Architecture (تعمیرات) کے سائنسی میدانوں میں نمایاں خدمات

انجام دی ہیں۔

اسلام اور مغرب کے درمیان رابطہ بڑھانے کے لیے سعودیہ عربیہ نے یوکے میوزیم کو تقریباً ۱۳ ملین سعودی ریال دیا ہے، اس سے میوزیم میں سعودی اسلامی گیلری بنائی جائے گی، یہ اسلامی گیلری برٹش کے قدیم ترین میوزیم ''ایشمولین میوزیم آف آکسفورڈ یونی ورسٹی'' میں قایم کی جائے گی، جہاں پہلے ہی سے مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کا شان دار کلکشن نمایش کے لیے موجود ہے، گنیز بک آف ریکارڈ کے مطابق ایشمولین میوزیم عوام کے لیے کھولا جانے والا دنیا کا پہلا میوزیم ہے جس کا سرکاری افتتاح ۱۶۶۳ میں ہوا تھا، یہ میوزیم متعدد اسلامی ملکوں کے نوادر کا مخزن ہے۔

مسلم والیس یوکے نے ایک ویب سائٹ اپریل میں شروع کیا ہے، یہ ویب سائٹ انٹرنیٹ پر مسلمانوں کا سروے کرے گا تا کہ برطانوی مسلمانوں کو درپیش دشواریوں اور اہم مسائل میں ان کی مناسب رہنمائی کرے، یوکے میں اس نوعیت کا یہ پہلا ویب سائٹ ہوگا، اس کے آرگنائیزر کا کہنا ہے کہ اس کی دس فی صد آمدنی خیراتی اداروں پر صرف کی جائے گی۔

کولمبیا یونی ورسٹی کے افریقن اسٹڈیز کے ڈائرکٹر محمود ممدانی کا نام ماہر اور کامیاب سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں میں شامل ہے، ان کی ۳۲۰ صفحات پر مشتمل تازہ ترین تصنیف "Good MuslimBad Muslim" نیویارک سے شایع ہوئی ہے جو درحقیقت ان حوادث کا چشم دید مشاہدہ ہے جن سے مشرق وسطیٰ بالخصوص افغانستان، عراق اور فلسطین کے مسلمان گزر رہے ہیں، اس کتاب کے باب "Citizen and Subject" میں ان ملکوں میں بھی اسی استعماری سیاست کا نمونہ پیش کیا گیا ہے جن کا سلسلہ افریقی مستعمرات میں پہلے سے جاری ہے اور باب "When Victim Become Killer" میں مصنف نے Rwandan نسل کشی کے مذموم مقاصد، اغراض پر روشنی ڈالی ہے۔

ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

قرآن مجید کے معرب الفاظ

باسمہ تعالیٰ

یکم جولائی ۲۰۰۵ء
جے نگر، نیل بگان،
نوگاؤں، آسام۔

محترم اڈیٹر صاحب! زید علمہ و فضلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

''معارف'' اپریل ۲۰۰۵ء میں راقم حروف کا جو مقالہ بہ عنوان ''قرآن مجید کے معرب الفاظ'' شایع ہوا تھا، اس پر مئی کے شمارے میں ''استدراک'' شایع کیا گیا ہے۔

۱- میں نے اَبّ (عبس: ۳۱) کے معنی باپ لکھے تھے، یہ ضرور غلط ہے مگر آپ کا تحریر کردہ معنی ''تروتازہ اور شاداب گھاس اور چارے'' مجھے تسلیم نہیں ہے، اس کے معنی مطلق ''گھاس اور چارہ'' ہیں۔(۱)

۲- مغربی کی مراد اہل لغت کے نزدیک متعین نہیں ہے، بلاد مغرب وہ بلاد ہیں جو غربی مصر میں افریقہ کے شمال میں واقع ہیں اور وہ لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش ہیں اور آج کل مغربی مملکت سے وہ جز (خطہ) مراد ہے جو غربی الجزائر میں بلاد مغرب کے بالکل کنارے واقع ہیں، جس کی حد بندی شمالی رو سے بحر متوسط اور مغربی رو سے محیط اطلس کیے ہوئے ہیں صحیح مسلم کی حدیث ''لا یزال اھل الغرب ظاھرین علی الحق'' کے تحت مشہور شارح علامہ نوویؒ نے لکھا ہے:

''علی بن المدینی نے فرمایا: اہل غرب سے مراد عرب ہیں، کیونکہ عموماً بالخصوص یہی لوگ بڑے بڑے ڈول استعمال کرتے ہیں اور دوسرے علمانے کہا: اس سے مراد غربی زمین (خطہ) ہے اور معاذؓ نے کہا: وہ لوگ (اہل غرب) شام میں ہیں، ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ یہ سب بیت المقدس میں ہیں اور بعض لوگوں نے کہا: یہ اہل شام اور ان کے ماورائی باشندے ہیں اور قاضیؒ نے کہا کہ بعض لوگوں نے کہا:

(۱) اس کے ثبوت میں لغت کی کتابوں کے بجائے قاموس القرآن، مصباح اللغات اور بعض تراجم کو پیش کیا گیا ہے، آگے بھی تحقیق کا یہی انداز ہے۔ ض

اہل غرب سے مراد سخت اور مضبوط لوگ ہیں اور ہر شے کا غرب اس کی حد ہے''۔

۳-''اخلد'' کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ اس مفہوم میں قدیم عربی شاعری میں اس کا استعمال موجود ہے مگر علامہ سیوطیؒ ''الاتقان'' میں لکھتے ہیں:

''واسطی نے ''الارشاد'' میں کہا: عبرانی میں اخلد الی الارض کے معنی'' وہ مائل ہوا اور جھکا'' ہیں۔

۴-''غیض'' (ہود: ۴۴) کے میرے ترجمے ''خشک کیا گیا، گھٹایا گیا'' سے زیادہ بہتر اور مناسب ترجمہ آپ نے ''اتر گیا'' لکھا ہے مگر میرا ترجمہ قاموس القرآن اور موضح القرآن سے منقول ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے ''سکھا دیا گیا'' اور حضرت تھانویؒ نے ''گھٹ گیا'' کیا ہے۔

۵-''کفر'' کے میرے ترجمے کی جو تصحیح کی گئی ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، میرا ترجمہ قاموس کے علاوہ موضح القرآن ''دور کر''، ترجمہ شیخ الہندؒ ''دور کر دے'' اور بیان القرآن ''زائل کر دیجیے'' سے لیا گیا ہے۔

۶-''قسورۃ'' کا ترجمہ مختلف ترجموں میں مختلف کیا گیا ہے، اول و آخر دونوں مترجموں نے بالاتفاق اس کا ترجمہ شیر اور درمیانی مترجم نے ''غل مچانا'' کیا ہے، اسی لیے میں نے ایک ترجمہ پر اکتفا کرنا درست نہیں خیال کیا۔

۷-''ھود'' کو راقم نے عبرانی نہیں بلکہ اعجمی لفظ بتایا ہے، باقی استدراک درست ہے۔

والسلام

مظہر الاسلام قاسمی

....

جامعہ کراچی کا بشارت نامہ
معارف کا اشاریہ

۱۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء

شعبہ اسلامی تاریخ،

جامعہ کراچی، پاکستان۔

محترم و مکرم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب اطال اللہ عمرک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے، میں آپ کو خط لکھنے کی سعادت پہلی بار حاصل کر رہا ہوں لیکن

دو مرتبہ آپ سے بذریعہ ٹیلی فون ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے، اس سے پہلے میں آپ کو محترم جناب عبدالوہاب خان سلیم صاحب اور محترمی سید معراج جامی صاحب کی وساطت سے معارف کے متفرق شماروں کے لیے زحمت دیتا رہا ہوں اور آپ کی ذرہ نوازی و کرم فرمائی کا ممنون ہوں۔

سید معراج جامی صاحب کے توسط سے مجھے آپ کی جانب سے بھیجے گئے جولائی ۱۹۷۵ء کے شمارہ کے عکس موصول ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، جزاک اللہ فاحسن الجزاء۔

اب سے تقریباً سال بھر پہلے محض اپنے شوق اور پروفیسر ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ، صدر شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی کی تحریک پر ماہنامہ ''معارف'' کی اشاریہ سازی کا کام شروع کیا تھا، کام شروع کرنے کے بعد اس راہ میں حائل دشواریوں کا اندازہ ہوا کہ کراچی کی کسی لائبریری میں معارف کی مکمل فائل موجود نہیں تھی، لہٰذا ایک سال کا عرصہ تو معارف کی فائل مکمل کرنے میں لگ گیا، اس سلسلے میں پہلے تو پاکستان کے دیگر شہروں کے اہم کتب خانوں سے رابطہ کیا گیا اور جو شمارے دیگر شہروں سے بھی دستیاب نہ ہو سکے، ان کے لیے آپ کو زحمت دی گئی۔

اب الحمدللہ ماہنامہ ''معارف'' کا نوے سالہ (جولائی ۱۹۱۶ء تا جون ۲۰۰۵ء) اشاریہ مکمل ہے، یہ اشاریہ معارف میں شائع ہونے والے مقالات اور تبصرہ شدہ کتب پر مشتمل ہے۔ ان شاء اللہ رواں سال کے اواخر تک اس کی اشاعت عمل میں آ جائے گی، جیسے ہی اس کی اشاعت عمل میں آئی، سب سے پہلے اس کے کچھ نسخے آپ ہی کی خدمت میں روانہ کیے جائیں گے۔

مادیت کے اس دور میں وسائل کی کم یابی اور دیگر مشکلات کے باوجود آپ اور آپ کے رفقا جو علمی، تحقیقی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ قابل صد ستائش ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے۔

کرم فرمائی کے لیے مکرر شکریہ!

حفظکم اللہ وعافاکم!

والسلام

محمد سہیل شفیق

....

ادبیات

دوغزلہ

غزل (۱)

(نذر فانی)

از:- جناب وارث ریاضی صاحب☆

جب پریشاں گیسوے پُرخم نظر آیا مجھے
منتشر شیرازۂ عالم نظر آیا مجھے

موسم گل میں پریشاں، جاں بہ لب، محوِ فغاں
برگ گل پر قطرۂ شبنم نظر آیا مجھے

کیا بتاؤں؟ کیوں مرے آئینۂ تقدیر میں؟
آپ کی زلفوں کا پیچ وخم نظر آیا مجھے

ہرطرف پھیلا ہے آزاروں کا بحرِ بے کنار
ہر قدم پر کوہسار غم نظر آیا مجھے

رند تشنہ لب، شکستہ جام مے، ساقی اداس
یوں نظام مے کدہ درہم نظر آیا مجھے

جب کسی روتے کو دیکھا دیر تک رویا کیا
دوسرے کا غم بھی اپنا غم نظر آیا مجھے

مہربانی پر رہا نا مہربانی کا گماں
التفاتِ یار یوں مبہم نظر آیا مجھے

کائنات آگہی کے حسن میں محو خرام
اہتمامِ جہدِ مستحکم نظر آیا مجھے

سیکڑوں ایسے مسائل ہیں کہ جن کی بھیڑ میں
زیست کا محرم بھی نا محرم نظر آیا مجھے

یوں تو دنیا میں بہت انسان ہیں وارث مگر
شرف ان میں آدمی کا کم نظر آیا مجھے

غزل (۲)

اشک غم میں ہر بشر پُرنم نظر آیا مجھے
یہ جہاں اک آبشارِ غم نظر آیا مجھے

اے خوشا ستم! چمن زار محبت میں مدام
درد وغم کا گل فشاں موسم نظر آیا مجھے

☆ کاشانۂ ادب سکھا (دیوراج)، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، 845453۔

میں نے دیکھا شعلۂ حرص وہوس اٹھتا ہوا
جب چراغ آرزو مدھم نظر آیا مجھے

میں جواں تھا، وہ جواں تھے مطرب وساقی جواں
جب جوانی تھی، جواں عالم نظر آیا مجھے

جس نے مجھ جیسے ہزاروں کو ہزاروں غم دیے
آج وہ بھی مبتلاے غم نظر آیا مجھے

آدمی ایسا کہ جس کا دل ہو مثل آینہ[۱]
گلشن کون ومکاں میں کم نظر آیا مجھے

کیا ستم ہے، ان دنوں اہل ہوس کے درمیاں
اقتدار قوم کا پرچم نظر آیا مجھے

ظالم وسفاک وجابر، کینہ خو، شیطاں نفس
تاج[۲] دار کشور محکم نظر آیا مجھے

اے بہار آرزو! تیری اداے جور میں
زندگی کے زخم کا مرہم نظر آیا مجھے

عشق کی دنیا بھی کیا دنیا ہے، اے وارث جہاں
رنج میں راحت، خوشی میں غم نظر آیا مجھے

ضروری تصحیح

گزشتہ شمارہ (اکتوبر ۲۰۰۵ء) میں ادبیات کے تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "چھاؤ" کو "چھانو" اور معارف کی ڈاک کے پہلے صفحہ کے پہلے پیراگراف کی آخری سطر میں "کوئی کام" کو "کوئی عام" پڑھا جائے۔

---

[۱] آئینہ کی مخفف صورت آئنہ ہے، یہ لفظ بہ یاے معروف ومجہول دونوں طرح مستعمل ہے۔ (فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ۲۴۳)

[۲] صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ تدوین سیرت: از جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدر آباد۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے ایک ایک پل کو آپ ﷺ کے اصحاب کرامؓ اور پھر ان کے فیض یافتگان نے جس طرح سینے سے لگائے رکھا اور جس طرح ان حضرات کی زبانیں ذکر سرور عالم ﷺ سے تر رہیں، وہ اب تاریخ انسانی کی ایک زندہ حقیقت ہے اور اسی کی بنیاد پر تدوین سیرت کا وہ بے مثال علمی و تاریخی سلسلہ سامنے آیا جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا کا کوئی مذہب اور تاریخ اب تک قاصر ہے، عربی، فارسی اور اردو زبانوں ہی میں سیرت کے موضوع پر اس قدر سرمایہ ہے جو حد وشمار سے باہر ہے، ان کے علاوہ دنیا کی اور زبانوں میں بھی ذکر رسولؐ کی رفعت کی حد نہیں، ادب سیرت کی نمائندہ اور اہم کتابوں کی فہرست سازی اور کتب شماری کی کوششیں بھی جاری ہیں، زیر نظر کتاب گو مختصر ہے تاہم فن سیرت کی کتب شماری میں اس کی اہمیت کم نہیں، فاضل مصنف کو اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل ہے اور مراجع و مصادر کے حصول میں ان کو سہولت بھی ہے، چنانچہ انہوں نے قاہرہ کے دار الکتب المصریہ اور ریاض کے مکتبہ الفیصل العلمیہ کے کیٹلاگ حاصل کیے، زیراکس کاپیاں جمع کیں اور ان کے علاوہ اس باب میں ڈاکٹر صالح بن حمید کے زیر نگرانی تیار کی گئی موسوعہ نضرۃ النعیم سے بھی استفادہ کیا اور اندازہ ہوتا ہے کہ تمام کتب سیرت کے اشاریے کی جگہ انہوں نے عربی اور اردو کی اہم اور بنیادی کتابوں کے ذکر کو کافی سمجھا اور بہ قول فاضل مؤلف "یہ بات دل و دماغ کو متاثر کرنے لگی کہ کتابوں کے نام سننے سے زیادہ تاریخ تدوین اور قابل اعتبار کتابوں کے نام یکجا کرنے کی کوشش کی جائے"، چنانچہ باب اول اسی کوشش کا عمدہ نتیجہ ہے، جس میں عرب اور علم تاریخ اور سیرت کے مآخذ، تدوین اور اولین سیرت نگاروں پر پُر از معلومات بحث کی گئی ہے، قرآن مجید کو سیرت النبیؐ کا معتبر ترین ماخذ قرار دے کر یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ نزول قرآن کے زمانے میں سیرت نگاری کا کام اسی لیے نہیں ہوا کہ اس سے خلط ملط ہو جانے کا امکان تھا، صحابہ کرامؓ کی زندگی میں سیرت کے متعلق تحریری یادداشتیں ضرور لکھی گئیں لیکن فاضل مصنف کے نزدیک یہ تحریری سرمایہ ان روایتوں کے مقابلے میں مشکوک ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، باب دوم میں سیرت نبوی کے اہم عنوانات کا بیان ہے اور اس سلسلے میں حضور ﷺ کے شمائل و فضائل اور اخلاق و دلائل کے متعلق معتبر و مستند کتابوں کی ایک منتخب فہرست خاص طور پر محققین سیرت کے لیے بہت مفید ہے، باب سوم سیرت النبیؐ کے بعض اہم مضامین مثلاً تقویٰ، حسن اخلاق و توکل وغیرہ کی تشریح میں ہے اور یہ اصلاً

اس جذبے کے تحت ہے کہ سیرت کے بحر زخار سے چند قطرے عقیدت و فدائیت کے آبگینوں کی شکل میں پیش کیے جا سکیں، ادب و اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ تحریریں بڑی دل کش ہیں، مولانا سید محمد رابع ندوی کے قلم سے مقدمہ ہے اور نگاہ اولین کے عنوان سے مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم کی تحریر ہے، وہ اس کتاب کے ناشر بھی تھے اور اردو میں کتب سیرت کے عنوان سے ان کی ایک جامع تحریر بھی اس میں شامل ہے۔

نقوش تابندہ: از جناب اخلاق احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۶۸، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ اور شہاب الدین اعظمی، 4/13314، سر سید نگر علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ وغیرہ۔

قریب پچیس شخصیتوں پر احساس و خیال کے اظہار کا یہ ایک خوبصورت مرقع ہے، جس کے پس منظر میں گو علی گڑھ کے رنگ اور عکس زیادہ گہرے ہیں لیکن دوسرے رنگوں کی آمیزش نے اس کے کینوس کو وسعت دے کر اس کی جاذبیت میں اور اضافہ کر دیا ہے، سر سید کے یکے از حواریین خان بہادر سید زین العابدین سے پروفیسر ظفر الاسلام تک ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ ہے ان تمام شخصیتوں کے نقوش کی تابندگی، ان تمام تذکروں پر خاکہ نگاری کا اطلاق کامل طور پر نہیں ہو سکتا، مصنف کو بھی اس کا احساس ہے کہ فن خاکہ نگاری کے قواعد پر وہ پورے نہیں اترتے لیکن وہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ خاکہ نگاری حق گوئی کا دوسرا نام ہے اور یہ کہ سوانح نگاری اور ہے اور خاکہ نگاری اور، مولوی زین العابدین، سر شاہ سلیمان، مولانا اسلم جے راج پوری، راہل سنکر اتین کے متعلق تحریریں ان کی زندگی اور اکتسابات زندگی کی داستان سناتی ہیں اور داستان گو کبھی عالم جذب میں اور کبھی عالم حیرت میں نظر آتا ہے، علامہ شبلی کے متعلق تو عنوان ہی واضح ہے کہ "مکتوبات کے آئینے میں"، لیکن یہ آئینہ یک رخا زیادہ ہے، یہ خیال محل بحث ہو سکتا ہے کہ "شبلی جب علی گڑھ، حیدر آباد اور ندوہ سے واپس ہوئے تو نام وری کے ساتھ ساتھ نامرادی بھی ساتھ لائے"، یہ کہنا بھی شاید صرف زور قلم ہے کہ "رانگا سانگا کی طرح جنگ پر جنگ ہارنے کے باوجود شبلی کی کوششوں، ارادے اور کام کرنے کی لگن کم نہیں ہو رہی تھی"، اسی طرح شبلی کی عائلی زندگی کے متعلق قریب ایک صفحہ صرف ماضی شکی کی گردان کی نذر ہو گیا، سر شاہ سلیمان کے متعلق تحریر مقالے کی تعریف میں آتی ہے، یہی حال راہل سنکر اتین اور مولانا اسلم جے راج پوری اور اقبال سہیل کا بھی ہے لیکن علمی و تاریخی معلومات سے پر ہونے کے باوجود انداز و اسلوب کی دل کشی نے ان کو بڑا پر لطف بنا دیا ہے، خلیل الرحمان اعظمی کی یادوں کی روشنی اس مجموعہ مضامین میں سب سے تابناک ہے، یہ مضمون شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، خاکہ و سوانح نگاری اور مشاہدات و تاثرات کی خوبیوں سے یہ موثر ترین تحریروں میں شامل ہونے کے لائق ہے، مولانا عبدالباری ابو علی اثری کی یادیں ان کے جاننے والوں کے دلوں پر ایک بار پھر دستک دینے میں کامیاب ہیں، ان کے متعلق یہ احساس بالکل درست ہے کہ ان کی صلاحیت کے لحاظ سے ان کو رتبہ نہیں ملا ورنہ دار المصنفین کے

ذکر میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جاتا، آل احمد سرور کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ فن کار کی خوبیوں کے ساتھ ان کو زیست کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ڈھنگ بھی تھا، دور اندیشی اور ہوش مندی کی صلاحیتوں سے انہوں نے خود کو افلاس اور زبوں حالی سے بچالیا، سچائی کی شیریں اسلوبی یہی ہے، اردو کے فن تراجم و تذکرہ نگاری میں یہ نقوش تابندہ عرصے تک زندہ و پائندہ رہیں گے۔

مولانا سید شاہ غیاث الدین حسن شریفی رضوی، حیات اور شاعری: از جناب ساحل شہسرامی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۶، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر فیاض ہومیو کلینک، فیاض کمپلکس، دھرم شالہ روڈ، شہسرام، بہار۔

شیر شاہ سے منسوب بہار کی مردم خیز بستی شہسرام یا سہسرام کی تاریخی اہمیت ظاہر ہے، اسی بستی کے ایک نیک نام فرزند کی زندگی زیر نظر کتاب میں سلیقے سے پیش کی گئی ہے، وہ صوفی عالم تھے، تصنیف و تالیف کا شغل بھی تھا، ان کی زیادہ تر کتابیں مسائل تصوف سے متعلق اور اب تک غیر مطبوع ہیں، شاعر بھی تھے اور فارسی اور اردو دونوں میں مشاق تھے، کلام قریباً تمام کا تمام نعت و منقبت میں ہے، خواجگان بغداد و اجمیر کی منقبت میں والہانہ جذبات کا اظہار ہے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی ان کے استاذ و مرشد تھے، ان کا اثر سوانح میں جگہ جگہ نظر آتا ہے، کتاب کا حسن ظاہر بھی لائق تعریف ہے اور اس کے لیے صاحب تذکرہ کے سعادت مند حفید ڈاکٹر سید معراج الاسلام بھی قابل تحسین ہیں۔

امجد غزنوی بزم شبلی کی آخری شمع: از جناب فخر عالم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۷۱، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: نوشین پبلی کیشنز، ۱۵۰، اندرا نگر جے نگر کالونی، حیدر آباد، اے پی۔

اعظم گڈھ کے قادر الکلام، پختہ مشق اور خوش فکر شعرا کی فہرست میں امجد غزنوی مرحوم کا نام ضروری ہے، نسبتاً وہ کم نام رہے اور ان کی شہرت کی خوشبو عام نہیں ہوئی لیکن ان کا کلام سخن سنجوں میں ہمیشہ مستحق داد رہا، ان کی زندگی بے نیازانہ گزری مگر اس میں دوسروں کے لیے کشش بھی رہی، اس کتاب کے لائق اور نوجوان مصنف مبارک باد کے لائق ہیں کہ ایم فل کے مقالے کے لیے انہوں نے غزنوی مرحوم کی شخصیت و شاعری کا انتخاب کیا اور مقالے کا حق ادا کردیا، امجد غزنوی کی شاعری میں احترام انسانیت، فلسفۂ عمل اور مسائل تصوف کی نشان دہی کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان کی شاعری اقبالین یعنی علامہ اقبال اور اقبال سہیل سے متاثر تھی اور ان میں بھی اول الذکر کا اثر غالب ہے، شروع میں اعظم گڈھ کا ادبی پس منظر بھی بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اس میں یحیٰی اعظمی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہیں نے اعظمی کی نسبت کا اظہار کیا لیکن ان سے بہت پہلے علامہ شبلی نے تہذیب الاخلاق میں الاعتزال والمعتزلہ مضمون اسدی الاعظمی کے نام سے لکھا تھا۔

ع - ص

دار المصنفین کا سلسلہ ادب و تنقید

کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔ شعر العجم اول (جدید محقق ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	248	85/-
۲۔ شعر العجم دوم	علامہ شبلی نعمانی	214	65/-
۳۔ شعر العجم سوم	علامہ شبلی نعمانی	192	35/-
۴۔ شعر العجم چہارم	علامہ شبلی نعمانی	290	45/-
۵۔ شعر العجم پنجم	علامہ شبلی نعمانی	206	38/-
۶۔ کلیات شبلی (اردو)	علامہ شبلی نعمانی	124	25/-
۷۔ شعر الہند اول	علامہ شبلی نعمانی	496	80/-
۸۔ شعر الہند دوم	علامہ شبلی نعمانی	462	75/-
۹۔ گل رعنا	مولانا سید عبد الحئی حسنیؒ	580	75/-
۱۰۔ انتخابات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	424	45/-
۱۱۔ اقبال کامل	مولانا عبد السلام ندوی	410	75/-
۱۲۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں (دوم)	سید صباح الدین عبد الرحمن	402	50/-
۱۳۔ صاحب المثنوی	قاضی تلمذ حسین	530	65/-
۱۴۔ نقوش سلیمانی	مولانا سید سلیمان ندوی	480	75/-
۱۵۔ خیام	مولانا سید سلیمان ندوی	528	90/-
۱۶۔ اردو غزل	پروفیسر یوسف حسین خاں	762	120/-
۱۷۔ اردو زبان کی تمدنی تاریخ	عبد الرزاق قریشی	266	40/-
۱۸۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام	عبد الرزاق قریشی	236	75/-
۱۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات	سید صباح الدین عبد الرحمن	70	15/-
۲۰۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	سید صباح الدین عبد الرحمن	358	70/-
۲۱۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول)	خورشید نعمانی	422	140/-
۲۲۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم)	خورشید نعمانی	320	110/-
۲۳۔ موازنہ انیس و دبیر	علامہ شبلی نعمانی	312	95/-